سونامی کے متاثرین کی امداد کیجئے

سونامی' زلزلہ اور سمندری طوفان سے متاثرہ سات ممالک کے تباہ حال لاکھوں افراد' جن میں عورتیں' بچے اور ضعیف سبھی شامل ہیں' کھلے آسمان تلے بے یارومددگار پڑے ہوئے ہیں اور ہم سب کی امداد واستعانت کے منتظر ہیں۔ طلوع اسلام آپ سے پرزور اپیل کرتا ہے کہ قدم بڑھایئے اور تباہ حال انسانیت کی مقدور بھر امداد فرمایئے۔ آپ کی سہولت کے لئے طلوع اسلام نے بھی اس سلسلہ میں ایک فنڈ قائم کیا ہے۔ آپ اپنے عطیات بذریعہ بنک ڈرافٹ' چیک' منی آرڈر یا براہِ راست ادارہ طلوع اسلام کو ارسال فرما سکتے ہیں۔

الداعی الی الخیر
ادارہ طلوع اسلام (رجسٹرڈ)
25۔بی' گلبرگ 2' لاہور۔

سانحہ ارتحال

محترم محمد زمرد بیگ اکاؤنٹینٹ ادارہ طلوع اسلام کی رفیقۂ حیات طویل علالت کے بعد انتقال کر گئی ہیں۔ مرحومہ نیک دل اور پاکیزہ مزاج تھیں۔ دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ مرحومہ کو کروٹ کروٹ جنت نصیب کرے اور پس ماندگان واعزہ واقارب کو صبرِ جمیل سے نوازے۔ ادارہ محمد زمرد بیگ صاحب اور ان کے فرزند اور دخترانِ نیک اختر کے غم میں برابر کا شریک ہے۔

(ادارہ طلوع اسلام)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

محمد سلیم اختر

لمعات

جوں جوں ملک میں قرآنی فکر عام ہو رہی ہے طلوع اسلام کے خلاف پروپیگنڈہ بھی تیزی سے بڑھایا جا رہا ہے۔ حتیٰ کہ بعض حلقوں میں اس کی شدت اشتعال تک پہنچا دی جاتی ہے۔ ہمیں اس پر کبھی اعتراض نہیں ہوا کہ جو کچھ ہم پیش کرتے ہیں اس سے اختلاف کیوں کیا جاتا ہے۔ ہم نے کبھی یہ نہیں کہا کہ ہم جو کچھ کہتے ہیں وہ خدا کی طرف سے وحی ہے' جس سے کسی کو اختلاف کا حق حاصل نہیں۔ جو کچھ ہم پیش کرتے ہیں وہ قرآن کریم کی تعلیم کو سمجھنے کی انسانی کوششوں کا نتیجہ ہے' جس میں سہو بھی ہو سکتا ہے اور خطا بھی۔ جو کوئی ہمیں ہماری غلطی پر متنبہ کرتا ہے ہم اس کے شکر گذار ہوتے ہیں بشرطیکہ وہ اپنی بات کی تائید میں قرآن کریم کی سند رکھتا ہو۔ لیکن ہمارے خلاف پروپیگنڈہ کرنے والوں کی کیفیت جدا ہے۔ وہ یہ نہیں کرتے کہ جو کچھ طلوع اسلام یا پرویز مرحوم نے کہا اسے اس کے الفاظ میں اپنے قارئین یا سامعین کے سامنے' سیاق وسباق' کے ساتھ پیش کر کے اس پر قرآن کریم کی روشنی میں تنقید کریں۔ وہ کرتے یہ ہیں کہ اپنی طرف سے ایک غلط بات وضع کر کے' گالیاں دینا شروع کر دیتے ہیں۔ چونکہ ہماری قوم بھی عام طور پر سہل انگار واقع ہوئی ہے اس لئے کوئی اس بات کی تحقیق کرنے کی زحمت گوارا نہیں کرتا کہ جو کچھ کسی کی طرف منسوب کیا گیا ہے وہ اس نے کہا بھی ہے یا نہیں۔

1990ء میں جناب خورشید احمد ندیم کا ایک مضمون ''پرویز صاحب کی اصل غلطی'' محترم جاوید احمد غامدی کے زیر ادارت شائع ہونے والے ماہنامہ ''اشراق'' میں شائع ہوا تھا جس کا جواب ماہنامہ طلوع اسلام میں بھی شائع کیا گیا۔ اب 2004ء کے اواخر میں ایک کتابچہ ''پرویز صاحب کا فہم قرآن'' اردو بازار کے ایک پبلشر کی طرف سے شائع ہوا ہے جس میں مذکورہ بالا مضمون کے علاوہ جاوید احمد غامدی صاحب کے خطاب کی تسوید اور مقدمہ و پیش لفظ شامل ہے۔ اسی کتابچے کو مختلف رسائل و جرائد میں بھی باصرار شائع کرانے کی کوشش کی گئی ہے جس کے نتیجے میں ماہنامہ بیدار ڈائجسٹ نے جولائی 2004ء میں اور ماہنامہ ''سوئے حرم'' نے دسمبر 2004ء میں اسے شائع کیا۔

''طلوع اسلام'' کج بحثی میں شامل ہونے سے ہمیشہ احتراز کرتا ہے اس لئے اب تک ہم نے اس کا نوٹس لینے کی چنداں ضرورت نہیں سمجھی لیکن اس کتابچے میں یہ تاثر دینے کی کوشش کی گئی ہے کہ طلوع اسلام کے پاس چونکہ اس کا کوئی جواب نہیں ہے اس لئے اس نے چپ سادھ رکھی ہے۔ مذکورہ کتابچے کے مرتب کے بھی استہزاء آمیز خط ادارہ کو موصول ہوئے اور کچھ

قارئین طلوع اسلام کا اصرار بھی کہ اس کے بارے میں کچھ لکھا جائے فلہٰذا اس پرچے میں خورشید احمد ندیم صاحب کے مضمون کو بنیاد بنا کر ایک سرسری سا محاکمہ پیش کیا جا رہا ہے۔ خورشید احمد ندیم صاحب کا دعویٰ ہے کہ ان کا یہ مضمون محترم جاوید احمد غامدی صاحب کے خطاب ہی سے ماخوذ ہے۔

مذکورہ بالا مضمون پر تفصیلی تبصرہ تو آپ اس شمارہ کے آئندہ صفحات میں ملاحظہ فرمائیں گے۔ البتہ ہم یہاں دو باتوں کی طرف اشارہ کرنا ضروری سمجھتے ہیں۔ مذکورہ کتابچہ میں عرض مرتب کے زیرعنوان ایک روایت کا ذکر کیا گیا ہے جسے مرتب نے ''چشم کشا تبصرہ'' سے تعبیر کیا ہے' جس میں حکیم موسیٰ امرتسری بیان کرتے ہیں کہ ایک بار عرشی صاحب سے غلام احمد پرویز کا ذکر چل نکلا تو انہوں نے فرمایا کہ:

> ''پرویز صاحب کے ترجمے کا اگر عربی میں ترجمہ کرایا جائے تو کچھ اور ہی کتاب تیار ہو جائے گی اور اس کا قرآن سے کوئی تعلق نہ ہوگا''۔

قارئین کرام کو اچھی طرح معلوم ہوگا کہ پرویز مرحوم نے قرآن کریم کا کبھی ترجمہ نہیں کیا۔ ان کا نقطۂ نظر یہ تھا کہ قرآن کریم کا ترجمہ کسی بھی زبان میں ممکن نہیں ہے۔ اگر کوئی قرآن کریم کو پڑھ کر اپنا ''مفہوم'' بیان یا تحریر کر دے تو اس کو ترجمہ نہیں بلکہ مفہوم کہنا چاہئے۔ اس موضوع پر پرویز مرحوم نے بیسیوں صفحات تحریر کئے ہیں۔ اسی بنا پر انہوں نے ''مفہوم القرآن'' تصنیف کی جسے ترجمہ کہنا پرلے درجے کی علمی بددیانتی ہے۔ پرویز صاحب عرشی مرحوم کے ممدوح تھے۔ ہم نہیں سمجھتے کہ یہ بات انہوں نے کہی ہوگی۔ بعینہٖ اسی طرح کی غلط فہمی محترم خورشید احمد ندیم صاحب کو ہوئی ہے انہوں نے سورہ تکویر کے لغوی ترجمے کا تقابل پرویز صاحب کے ''مفہوم'' سے کر کے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ پرویز مرحوم نے معاذ اللہ قرآن کریم کی تحریف کی ہے۔ حالانکہ یہ بات سب کو معلوم ہے کہ پرویز علیہ الرحمہ ترجمہ کے حق میں کبھی بھی نہیں رہے اور انہوں نے خود بھی مفہوم تحریر کیا ہے۔ جسے آپ ترجمہ اور تفسیر کے بین بین قرار دے سکتے ہیں۔ یہ علمی بددیانتی کی افسوس ناک مثال ہے۔

دوسری بات جو قابل ذکر ہے وہ خورشید احمد ندیم کی روایت کردہ ہے جسے محترم جاوید احمد غامدی صاحب سے منسوب کیا گیا ہے۔ کتابچہ مذکورہ کے صفحہ نمبر 15 پر غامدی صاحب کے حوالے سے تحریر کیا گیا ہے:

> ''اس زمانے میں جب میں نے ان کا مطالعہ کیا تو پہلی چیز جس سے مجھے وحشت ہوئی وہ ان کے لکھنے کا سلوب تھا۔ میں ادب کا آدمی رہا ہوں ایک خاص اسلوب تحریر ہی میرے ہاں کچھ بار پاتا ہے''۔

غامدی صاحب نے پرویز صاحب کے اسلوب نگارش پر اس انداز سے گرفت کی ہے گویا وہ خود ایک اتھارٹی ہیں۔ حالانکہ اسلوب کا پسندیدہ یا ناپسند خاطر ہونا اپنے اپنے انفرادی ذوق کا نتیجہ ہوتا ہے اور اس سے انسان کے اپنے ذوق کی سطح کا بھی اندازہ ہو

جاتا ہے۔ پرویز مرحوم کا اسلوب نگارش ہی واحد ایک چیز ہے جسے دشمنوں' دوستوں کے علاوہ اپنے اپنے دور کے مسلمہ ادیبوں' شاعروں نے سراہا ہے جن میں بابائے اردو مولوی عبدالحق' رئیس امروہوی' حفیظ جالندھری' احسان دانش' شورش کاشمیری سے لے کر عبدالوہاب عزام (مصر کے معروف ادیب جنہوں نے کلامِ اقبال کا ترجمہ عربی میں کیا۔) اور عبدالعزیز خالد تک شامل ہیں۔

تحریر ادبی ذوق کا آئینہ ہوتی ہے۔ محترم جاوید احمد غامدی صاحب کی نثر و نظم کو دیکھا جائے تو ان کے ذوق کی سطح بخوبی معلوم ہو جاتی ہے۔ ہم نے ان کی شاعری بھی پڑھی ہے لیکن معذرت کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ اس میں شعریت کے سوا سب کچھ ہوتا ہے۔ لیکن پھر بھی ہم کہتے ہیں کہ یہ ایک انفرادی ذوق سے متعلق اور موضوعی (Subjective) معاملہ ہے۔ ممکن ہے کچھ لوگ اس سے لطف اندوز ہوتے ہوں لیکن ایک دم سے ادبی فتویٰ اور وہ بھی سوادِ اعظم کے علی الرغم صادر کر دینا' ایک طرح کی عصبیت اور برخود غلط ہونے کی غمازی کرتا ہے۔

اس شمارے میں ہم نے خورشید احمد ندیم صاحب کا مضمون' جو بقول ان کے غامدی صاحب کے خطاب سے ماخوذ ہے' بھی شامل کر لیا ہے تاکہ قارئین کرام دونوں پہلوؤں سے آگاہ ہو کر حق و باطل کا خود فیصلہ کر سکیں۔

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

خورشید احمد ندیم

پرویز صاحب کی اصل غلطی

دینِ اسلام میں قرآنِ مجید کو بنیادی ماخذ کی حیثیت حاصل ہے۔ اس لئے اس دین کے فہم کا سب سے زیادہ انحصار بھی اس کتاب کے فہم پر ہے۔ اگر قرآن حکیم کو صحیح اصولوں کی روشنی میں سمجھا جائے تو دین کی مجموعی تعلیمات کو جانا جا سکتا ہے۔ اس سے یہ تو ممکن ہے کہ آدمی کسی جزوی مسئلے یا فروعی معاملے میں غلطی کا شکار ہو جائے' لیکن بحیثیت مجموعی وہ صراط مستقیم ہی پر رہتا ہے۔ ان اصولوں سے ہٹ کر' اگر کسی اور راستے سے فہم قرآن تک رسائی کی سعی کی جائے تو منزل کبھی ہاتھ نہیں آتی۔ اس سے یہ تو ہوسکتا ہے کہ آپ کسی ایک مسئلے میں صحیح رائے قائم کر لیں' لیکن اس دین کا سراغ آپ کو کبھی نہیں مل سکتا جس کی اقامت کا مطالبہ قرآن مجید کرتا ہے۔

آج ہمارے معاشرے میں ایسے افراد موجود ہیں' جن کا اصرار ہے کہ قرآن ہی ان کی فکر کا محور و مرکز ہے۔ انہوں نے قرآن مجید کو غلط اصولوں کی مدد سے سمجھنا چاہا۔ اس کوشش سے فہم قرآن کے دروازے تو ان پر نہ کھل سکے' البتہ ضلالت ان کا مقدر بن گئی۔

اس فکر کی اپنی ایک تاریخ ہے۔ دور جدید میں اسکی پیشوائی اور ترجمانی کا منصب جناب غلام احمد پرویز مرحوم کے ہاتھ رہا۔ انہوں نے اپنے آپ کو قرآن مجید کے ایک طالب علم کی حیثیت سے پیش کیا اور آخری لمحۂ حیات تک یہی کہتے رہے۔ انہوں نے آیات قرآنی کے جو مفاہیم و مطالب اخذ کئے' وہ ''مفہوم القرآن''' ''لغات القرآن''' ''مطالب الفرقان'' اور کئی دوسری کتابوں میں محفوظ ہیں۔ ان کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کے نزدیک اصل چیز لفظ کا لسانی پس منظر ہے۔ وہ اسی دروازے سے کسی لفظ کے قصر معانی میں داخل ہوتے ہیں۔ زبان کے بارے میں ان کا رویہ یہ ہے کہ وہ لفظ کے حقیقی و مجازی مفاہیم طے کرتے وقت' تشبیہہ و تمثیل کے کسی اصول اور سلسلۂ کلام کی کسی ضرورت کا لحاظ نہیں رکھتے۔

ہمارے نزدیک پرویز صاحب کی یہی بنیادی غلطی ہے' جس کے سبب سے قرآن مجید کا اصل مدعا ان پر واضح نہ ہو سکا۔ قرآن عربی زبان میں ہے اور ادب کا ایک شاہکار ہے۔ اس کی تفہیم کے لئے ضروری ہے کہ ان قواعد و ضوابط کو ملحوظ رکھا جائے' جن کا تعلق زبان اور ادب کے فہم سے ہے۔ پرویز صاحب نے اس بات کا اہتمام نہیں کیا۔ چنانچہ وہ تاویلات کا ایک طلسم ہوش ربا قائم کرنے میں تو کامیاب رہے' لیکن صحیح 'مفہوم القرآن' ان کی فہم سے باہر رہا۔ یہ بات اسی وقت پوری طرح سمجھ میں آ سکتی ہے۔ جب زبان و ادب کے وہ بنیادی مسلمات ہمارے پیش نظر ہوں' جن کا لحاظ

فہم قرآن کے لئے ناگزیر ہے۔

زبان اللہ تعالیٰ کا ایک بڑا عطیہ ہے۔ جو چیز انسان کو دوسری مخلوقات سے ممتاز کرتی ہے، وہ اس کی نطق وادراک کی صلاحیت ہے۔ دنیا کے مختلف حصوں میں آج کئی طرح کی زبانیں رائج ہیں۔ الفاظ کے اختلاف کے باوجود، اپنی اقدار کے اعتبار سے یہ بہت حد تک ایک جیسی ہیں۔ ہر زبان کی ابتدا اصوات سے ہوتی ہے۔ تہذیب کے آغاز سے پہلے صوتی تاثرات سے مختلف مفاہیم ادا کئے جاتے تھے۔ پھر آہستہ آہستہ یہ آوازیں لفظوں میں ڈھلیں اور اس سے باضابطہ زبانیں وجود میں آئیں۔ چنانچہ آج ہم جو لفظ بولتے ہیں، اس کا ایک متعین مفہوم ہوتا ہے۔ لفظ کے کسی خاص مفہوم کا اطلاق اس کے استعمال سے طے ہوتا ہے۔ یعنی آج کسی لفظ کو سمجھنے کے لئے ہم یہ دیکھیں گے کہ وہ ہمارے ماحول میں کس معانی میں مستعمل ہے۔ کوئی متکلم اس لفظ سے اپنے کلام اور تحریر میں کیا مفہوم مراد لیتا ہے۔ لہٰذا لفظ کا مطلب ومفہوم اس کے عرف استعمال سے متعین کیا جائے گا۔

کسی لفظ کے بارے میں دوسری چیز اسکی لسانی تحقیق ہے۔ لفظ اصل میں کیا ہے؟ اس کا مادہ کیا ہے؟ اس کی ابتدائی صورت کیا تھی؟ اور یہ کن مراحل سے گزرا ہے؟ اس ساری بحث کا تعلق علم لسانیات (Linguistics) سے ہے۔ بعض اوقات ایک زبان میں کئی دوسری زبانوں کے الفاظ مستعمل ہوتے ہین۔ لسانی تحقیق سے ہم یہ جان سکتے ہیں کہ کوئی لفظ کس زبان سے تعلق رکھتا ہے۔ اسی طرح عربی زبان میں علم لسانیات کی مدد سے کسی لفظ کا مادہ معلوم کیا جا سکتا ہے۔ لفظ کی اس لسانی تحقیق سے اس کا مفہوم طے کرنا، استخراج معنی کا صحیح طریقہ نہیں۔ لفظ کے فہم کا تعلق اسکے استعمال ہی سے ہوتا ہے۔ اب اگر کوئی شخص علم لسانیات کی مدد سے کسی لفظ کے معانی جاننے کی سعی کرے گا تو اس سے بے شمار مسائل پیدا ہو جائیں گے اور صحیح مطلب تک پہنچنا کبھی ممکن نہیں رہے گا۔ اس بات کو ایک مثال سے بہتر سمجھا جا سکتا ہے۔ آج کے دور میں لفظ ''شوربا'' کا ایک مفہوم متعین ہے۔ ہر شخص جانتا ہے کہ اس سے مراد کھانے کی ایک قسم ہے۔ اگر کوئی اپنے کھانے میں شوربے کے استعمال کا ذکر کرتا ہے تو مخاطب کے لئے مدعا پانا مشکل نہیں رہتا۔ اب ایک شخص لفظ ''شوربا'' کی لسانی تحقیق کرتا ہے کہ ''شور'' نمک کو کہتے ہیں اور ''با'' سے مراد پانی ہے۔ لہٰذا شوربے کا مطلب ہو گا ''نمکین پانی''۔ اس تحقیق کی رو سے کھانے میں ''شوربے'' سے مراد ''نمکین پانی'' کا استعمال ہے۔ صاف ظاہر ہے کہ لفظ کا یہ مطلب مراد لینے سے اس کا مفہوم بالکل بدل جائے گا۔ کلام میں شوربے کے وہی معانی مراد لئے جائیں گے جن کا تعین عرف عام کرتا ہے۔ اسی طرح اگر کوئی شخص یہ کہتا ہے کہ ''میں نے ٹیلی وژن خریدا'' تو اس جملے میں کوئی ابہام نہیں۔ عصر حاضر میں ہر فرد اس سے باخبر ہے کہ ''ٹیلی وژن'' سے کیا مراد ہے؟ لیکن لغوی تحقیق کے مطابق ''ٹیلی'' کا مطلب ''انتقال'' کے ہیں اور ''وژن'' منظر کو کہتے ہیں۔ لہٰذا ''میں نے ٹیلی وژن خریدا'' سے مراد ''میں نے انتقال منظر خریدا'' ہوگا۔ یہ لسانی ولغوی تحقیق درست ہونے کے باوجود فہم کلام میں مانع ہے۔ اس میں ٹیلی وژن کے اصطلاحی مفہوم کو نظر انداز کر دیا گیا ہے، جو متکلم کے پیش نظر ہے۔ اس بحث سے یہ واضح ہے کہ لفظ کے مفہوم کا تعلق اس کے استعمال سے ہے نہ کہ علم لسانیات سے۔

زبان کے بارے میں دوسری چیز تشبیہ، استعارہ اور

تمثیل وغیرہ کا استعمال ہے۔ ہر زبان اور ادب کا یہ مسلمہ اصول ہے کہ بہت سی باتیں تشبیہ اور استعارے کے پیرائے میں بیان کی جاتی ہیں۔ کبھی کسی مدعا کو واضح کرنے کے لئے تمثیلی انداز اپنایا جاتا ہے۔ یہ چیز جہاں زبان و بیان کا حسن ہوتی ہے' وہاں مفہوم کے ابلاغ کو بھی آسان بنا دیتی ہے۔ تشبیہ و استعارے میں بہت سے الفاظ اپنے حقیقی معنوں سے ہٹ کر مجازاً استعمال کئے جاتے ہیں۔ جملے کا دروبست' قرینہ اور کلام کا سیاق وسباق اس بات کا تعین کرتا ہے کہ یہاں لفظ مجازی مفہوم میں استعمال ہوا ہے یا حقیقی معنوں میں۔ مثال کے طور پر ایک شخص کہتا ہے: جب سے دوپہر کا کھانا کھایا ہے' سینے میں آگ لگی ہوئی ہے۔ دوسرا شخص کہتا ہے: گھر میں ایندھن نہیں تھا' چولہے میں آگ کیسے جلتی؟ ان دونوں جملوں کی ترکیب خود گواہ ہے کہ 'سینے کی آگ' اور 'چولہے کی آگ' کو ایک ہی مفہوم میں لینا ممکن نہیں۔ ''آگ'' کے مجازی اور حقیقی مفہوم کا تعین خود جملے نے کر دیا ہے۔ اب اگر پہلے جملے میں ''آگ'' کو حقیقی معنوں میں لیا جائے تو ایک مضحکہ خیز صورت حال سامنے آتی ہے' جسے ایک عام آدمی کا ذوق بھی گوارا نہیں کرتا۔ تمثیلی انداز کو جاننے کے لئے حضرت مسیح علیہ السلام کے مواعظ بہترین مثال ہیں' جن کے بارے میں انجیل کا کہنا ہے کہ وہ بغیر تمثیل کے کچھ نہ کہتے تھے۔ انجیل ہی میں ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے ایک دفعہ خطاب کرتے ہوئے فرمایا:

''آسمان کی بادشاہی اس آدمی کی مانند ہے جس نے اپنے کھیت میں اچھا بیج بویا۔ مگر لوگوں کے سوتے میں اس کا دشمن آیا اور گیہوں میں کڑوے دانے بھی بو گیا۔ پس جب پتیاں نکلیں اور بالیں آئیں تو وہ کڑوے دانے بھی دکھائی دیے۔ گھر کے مالک کے نوکروں نے آکر اس سے کہا کہ اے خداوند کیا تو نے اپنے کھیت میں اچھا بیج نہ بویا تھا؟ اس میں کڑوے دانے کہاں سے آ گئے؟ اس نے ان سے کہا: یہ کسی دشمن نے کیا ہے۔ نوکروں نے اس سے کہا: تو کیا تو چاہتا ہے کہ ہم جا کر ان کو جمع کریں؟ اس نے کہا: نہیں ایسا نہ ہو کہ کڑوے دانے جمع کرنے میں تم ان کے ساتھ گیہوں بھی اکھاڑ لو۔ کٹائی تک دونوں کو اکٹھا بڑھنے دو اور کٹائی کے وقت میں کاٹنے والوں سے کہہ دوں گا کہ پہلے کڑوے دانے جمع کر لو اور جلانے کے لئے ان کے گٹھے باندھ لو اور گیہوں میرے کھتے میں جمع کر دو''۔ (متی۔ باب 13)۔

اس تمثیل کی شرح میں انجیل ہی کا بیان ہے:

''اس وقت وہ بھیڑ کو چھوڑ کر گھر میں گیا اور اس کے شاگردوں نے اس کے پاس آ کر کہا کہ کھیت کے کڑوے دانوں کی تمثیل ہمیں سمجھا دے۔ اس نے جواب میں کہا کہ اچھے بیج کا بونے والا ابن آدم ہے اور کھیت دنیا ہے اور اچھا بیج بادشاہی کے فرزند اور کڑوے دانے اس شریر کے فرزند ہیں۔ جس دشمن نے ان کو بویا وہ ابلیس ہے اور کٹائی دنیا کا آخر ہے اور کاٹنے والے فرشتے ہیں۔ پس جیسے کڑوے دانے جمع کئے جاتے ہیں اور آگ میں جلائے جاتے ہیں ویسے ہی دنیا کے آخر میں ہو گا۔ ابن آدم اپنے فرشتوں کو بھیجے گا اور وہ سب ٹھوکر کھلانے والی چیزیں اور بدکاروں کو اس کی بادشاہی میں سے جمع کریں گے اور ان کو آگ کی بھٹی میں ڈال دیں گے۔ وہاں

رونا اور دانت پیسنا ہوگا۔ اس وقت راست باز اپنے باپ کی بادشاہی میں آفتاب کی مانند چمکیں گے۔ جس کے کان ہوں وہ سن لے''۔ (متی۔ باب 13)۔

اس مثال سے یہ بات واضح ہے کہ اگر بات تمثیل کے لہجے میں ہوگی تو لفظوں کو حقیقی مفہوم میں نہیں لیا جا سکتا ہے۔ اسی طرح حقیقی مفہوم کو مجازی مراد لینے سے بھی بات کا مدعا بدل جاتا ہے مثلاً ایک شخص کہتا ہے ''میں ساجد اور عابد کے ساتھ بازار گیا''۔ جملہ خود تعین کر رہا ہے کہ ساجد اور عابد معرفہ ہیں اور ان سے مراد خاص افراد ہیں۔ یہ مفہوم مراد لینے سے جملے کا مدعا بالکل واضح ہے۔ لیکن اگر جملے کی ساخت اور اس ظاہری مفہوم کو نظر انداز کر کے لغت کی مدد سے سمجھنے کی کوشش کی جائے تو کچھ اس قسم کی صورت حال سامنے آئے گی۔ ساجد' سجد سے اسم الفاعل ہے اور اسکے معانی خاکساری کرنے والے کے ہیں۔ اسی طرح 'عابد' کا مطلب 'حریص ہونا' ہے۔ لہٰذا جملے کا مطلب ہوگا ''میں ایک خاکسار اور ایک حریص آدمی کے ساتھ بازار گیا۔'' لغت کے لحاظ سے تو یہ صحیح مفہوم ہے' لیکن کیا جملے میں یہی بات کہی گئی ہے؟ ظاہر ہے کہ نہیں۔ لہٰذا کسی جملے یا عبارت کا مفہوم متعین کرتے ہوئے ضروری ہے کہ الفاظ کا حقیقی اور مجازی استعمال پیش نظر ہو۔

زبان کے حوالے سے ایک اور اہم چیز اس کا عرف عام ہے۔ کیونکہ بات کے فہم کے لئے زبان کا عرف بھی جاننا لازم ہے۔ مثلاً ''لفظ'' مصدر ہے۔ اسم فاعل اور اسم مفعول کے معنوں میں استعمال ہوتا ہے۔ مادے کی تحقیق کریں تو اس کا مطلب' 'پھینکی ہوئی چیز' ہے۔ لغت کو چونکہ اسی اصول پر ترتیب دیا جاتا ہے' اس لئے امام راغب کی ''مفردات'' اور ''تھابیس اللغہ'' میں یہی مفہوم لیا گیا ہے۔ لیکن جب ''لفظ'' کسی تحریر یا گفتگو میں استعمال ہوگا تو اس کا وہی مطلب قبول کیا جائے گا' جس کی اجازت زبان کا عرف دیتا ہے۔ یہ عرف زبان و معاشرے کا بھی ہوتا ہے اور کسی صاحب فن کا بھی۔ ''خودی'' کو سرسید جس مفہوم میں استعمال کرتے ہیں' وہ اس سے بالکل مختلف ہے' جو کلام اقبال میں پایا جاتا ہے۔ سرسید کے نزدیک یہ ایک منفی جذبہ ہے لیکن اقبال اس کو مثبت مفہوم میں لیتے ہیں۔

زبان و ادب کے ان مسلمات کی روشنی میں قرآن مجید کو دیکھئے۔ قرآن مجید' عربی زبان میں ہے' ایک خاص قوم اس کا اولین مخاطب ہے۔ اس قوم کا اپنا ایک تہذیبی پس منظر' روایات' زبان اور ادب ہے۔ قرآن ان سے انہی کی زبان میں ہم کلام ہوتا ہے۔ وہ قرآن کی بات پوری طرح سمجھتے ہیں۔ انہوں نے قرآن مجید کے پیغام کو ماننے سے انکار کر دیا' لیکن انہیں کسی لفظ کے مفہوم کے بارے میں کوئی اشتباہ نہیں ہوا۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ نے محض کتاب نہیں بھیجی بلکہ ساتھ ایک رسول بھی مبعوث کیا' جس کی سیرت قرآن کی تفسیر کرتی ہے۔ علاوہ ازیں قرآن مجید ایک کتاب ہے' جس کی ترتیب من جانب اللہ ہے۔ لہٰذا اس کا ایک سیاق ہے' ایک سباق ہے۔ ان سب باتوں سے بے نیاز ہو کر قرآن مجید کا مدعا پانا ممکن نہیں۔

آج کے دور میں قرآن مجید کی تفسیر کرتے ہوئے ضروری ہے کہ ان سب باتوں کا لحاظ رکھا جائے۔ ایک مفسر کے لئے ناگزیر ہے کہ وہ عرب معاشرے کی روایات' تاریخ عرب' عربی زبان اور اس کے مختلف اسالیب' جاہلی ادب اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت کا گہرا مطالعہ اور ذوق

رکھتا ہو۔ اسی طرح قرآن مجید کی یہ حقیقت کہ وہ ایک کتاب ہے اور اس کا یہ لفظ سیاق و سباق کے ایک نظم سے بندھا ہوا ہے' اس کے پیش نظر ہو۔

پرویز صاحب نے قرآن مجید کی تفسیر کرتے ہوئے' ان تمام باتوں کو نظر انداز کیا اور محض الفاظ کی لسانی تحقیق سے قرآن کو سمجھنے کی کوشش کی۔ اس سے قرآن مجید کی جو تصویر سامنے آتی ہے' وہ ایسی ہی ہے جیسے کلام اقبال میں کوئی ''خودی'' کا لغوی مفہوم داخل کر دے۔ (کلام اقبال سے کلام اللہ کی تمثیل ابلاغ مدعا کے لئے ہے۔ ورنہ قرآن مجید کا مقام اس سے بلند تر ہے کہ اسے کسی انسانی کلام کی مثل قرار دیا جائے۔) اس سے اقبال کی وہ بات جو وہ لوگوں تک پہنچانا چاہتے ہیں' وہ پس منظر میں چلی جائے گی اور ایک نیا مفہوم سامنے آ جائے گا۔ اسی طرح پرویز صاحب نے فہم قرآنی کے جو نقوش قائم کئے ہیں' اس سے قرآن کا مدعا تو واضح نہیں ہوتا' البتہ ''مفکر قرآن'' کا نقطۂ نظر جانا جا سکتا ہے' جسے انہوں نے قرآن مجید کی ہر آیت کے تحت بیان کیا ہے۔ چنانچہ دیکھئے سورۂ نمل کا وہ مقام جہاں حضرت سلیمان علیہ السلام کے واقعات بیان ہوئے ہیں۔ اس سے پہلے اس سورہ میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کے معجزات' عصا اور ید بیضا کا تذکرہ اور اس پر لوگوں کے ردعمل کو بیان کیا گیا ہے۔ بتانا یہ مقصود ہے کہ لوگوں کے کفر کا سبب یہ نہیں ہوتا کہ حقیقت ان کے لئے پردۂ راز میں ہوتی ہے۔ بلکہ ان کے انکار کی وجہ ان کا ظلم اور تکبر ہوتا ہے۔ کچھ لوگوں کو جب اللہ تعالیٰ نعمتوں سے نوازتا ہے تو وہ ظلم و استکبار کا رویہ اختیار کرتے ہیں۔ اس کے مقابلے میں انسانوں کا دوسرا طبقہ وہ ہے' جس پر اللہ تعالیٰ کے انعامات کی بارش ہوتی ہے' اور وہ ردعمل کے طور پر اس کے شکر گزار ہوتے ہیں اور اسے اللہ ہی کا فضل قرار دیتے ہیں۔ اس معاملے میں حضرت سلیمان علیہ السلام کو مثال کے طور پر پیش کیا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انہیں ایسی عظیم الشان سلطنت عطا فرمائی' جس کی نظیر تاریخ انسانی میں کہیں دکھائی نہیں دیتی۔ مگر وہ اس پر متکبر نہیں ہوئے بلکہ ان کا سر شکر گزاری کے جذبے کے ساتھ بارگاہ خداوندی میں جھک گیا۔ قرآن مجید میں ان کے واقعات کا ذکر کرتے ہوئے کہا گیا:

وحشر لسلیمٰن جنوده من الجن والانس والطیر فهم یوزعون o حتیٰ اذا اتوا علی وادالنمل قالت نملة یایها النمل ادخلوا مسٰکنکم لا یحطمنکم سلیمٰن و جنوده وهم لا یشعرون o(النمل' 18-17)۔

''اور سلیمان کے جائزے کے لئے اس کا سارا لشکر جنوں' انسانوں اور پرندوں سے اکٹھا کیا گیا اور ان کی درجہ بندی کی جا رہی تھی۔ یہاں تک کہ وہ چیونٹیوں کی وادی میں جا پہنچے۔ ایک چیونٹی نے کہا' اے چیونٹیو! اپنے سوراخوں میں گھس جاؤ کہ سلیمان اور اس کا لشکر تمہیں پامال نہ کر ڈالے اور انہیں اسکا احساس بھی نہ ہو۔''

غلام احمد صاحب پرویز ان آیات کا ترجمہ یوں کرتے ہیں:

''سلیمان کے لشکر میں شہروں کے مہذب باشندے' جنگلوں اور پہاڑوں کے دیوہیکل وحشی اور قبیلۂ طیر کے شاہسوار سب شامل تھے۔ انہیں (کیمپوں میں) روک کر رکھا جاتا تھا تاکہ مناسب ٹریننگ اور تربیت سے' ان سے مفید کام لئے جائیں۔ (ایک دفعہ کا ذکر

ہے کہ سلیمان کو معلوم ہوا کہ سبا کی مملکت اس کے خلاف سرکشی کا ارادہ رکھتی ہے تو وہ بطور حفظ ماتقدم' اس کی طرف لشکر لے کر روانہ ہوا۔ راستے میں وادیٔ نمل پڑتی تھی۔ ملکِ سبا کی طرح' اس مملکت کی سربراہ بھی ایک عورت تھی۔) جب اس نے اس لشکر کی آمد کی خبر سنی تو اپنی رعایا کو حکم دیا کہ وہ اپنے اپنے گھروں میں جا کر پناہ گزیں ہو جائیں۔ ایسا نہ ہو کہ لشکرِ جرار اتنا معلوم کئے بغیر کہ تم اس کے دشمن کی قوم سے کسی قسم کا تعلق رکھتے ہو یا نہیں' تمہیں یوں ہی کچل ڈالے۔ (فوجیں یہی کچھ کرتی ہیں' ان کے راستے سے ہٹ جانا ہی قرینِ مصلحت ہوتا ہے۔'')

(مفہوم القرآن' جلد دوم' ص 864)۔

پرویز صاحب نے یہاں جن' انس اور طیر کے معانی' بالترتیب' جنگلوں اور پہاڑوں کے دیو ہیکل وحشی' شہروں کے مہذب باشندے اور قبیلہ طیر کے شاہسوار' بیان کئے ہیں۔ اپنی لغوی تحقیق بیان کرتے ہوئے وہ کہتے ہیں:

''قرآن میں جن اور انس سے مراد وحشی اور متمدن انسان ہیں۔ انسان جو مانوس تھے اور جن جو وحشی اور غیر مہذب قبائل جنگلوں اور صحراؤں میں رہتے تھے۔'' (لغات القرآن' جلد اول' ص 447)۔

''جن'' اور ''انس'' عربی زبان کے معروف الفاظ ہیں۔ ان الفاظ کا اطلاق دو مختلف مخلوقات پر ہوتا ہے۔ کلام میں اس بات کا کوئی قرینہ موجود نہیں کہ الفاظ کے معروف معانی سے صرف نظر کرتے ہوئے انہیں نسل انسانی کے دو گروہوں سے متعلق قرار دیا جائے۔ لیکن جب کوئی شخص لفظ کے عام استعمال سے متعین ہونے والے مفہوم سے انحراف ہی کا ارادہ کر لے تو پھر کسی لفظ کا کوئی مطلب بھی لیا جا سکتا ہے۔ اس صورت میں تضاد بیانی سے بچنا بھی ممکن نہیں رہتا۔ پرویز صاحب بھی اس سے محفوظ نہ رہ سکے۔ چنانچہ وہ ''مفہوم القرآن'' میں' جس کا حوالہ اوپر گزرا ہے' ''الطیر'' کا مطلب ''قبیلہ طیر کے شاہسوار'' بیان کرتے ہیں اور دوسری جگہ ''لغات القرآن'' میں ''تیز رفتار گھوڑے''۔ وہ بیان کرتے ہیں:

فرس مطار۔ طیار

ہوشیار اور تیز رفتار گھوڑا۔

سورۂ نمل میں ہے کہ حضرت سلیمان کے لشکر جن' انس اور طیر پر مشتمل تھے۔ جن سے مراد وحشی قبائل ہیں۔ انس: مہذب آبادیاں اور طیر: تیز رفتار گھوڑے (رسالے)''۔

لغت کے استعمال کا یہی مظاہرہ انہوں نے 'وادیٔ نمل' اور 'نملۃ' کا مفہوم طے کرتے ہوئے کیا ہے۔ ان کا کہنا ہے:

''وادیٔ نمل چیونٹیوں کی جگہ نہیں بلکہ ایک قبیلے کے مسکن کا نام ہے اور النمل' اس قبیلے کا نام۔ نملۃ: اس قبیلے کی ایک عورت۔ معلوم ہوتا ہے کہ اس دور میں عورتیں عام طور پر قبائل کی رئیس ہوتی تھیں۔ جیسا کہ ملکہ سبا کے واقعے سے ظاہر ہے۔ یعنی یہ ان قبائل کا تمدن تھا۔'' (لغات القرآن۔ جلد چہارم۔ ص 1665)۔

یہاں 'نملۃ' سے وادیٔ نمل کی خاتون سربراہ مراد لینا' کسی طرح ممکن نہیں۔ 'نمل' عربی زبان میں اسم جنس ہے۔ اس سے کسی طرح قبیلہ مراد نہیں لیا جا سکتا اور اگر یہ فرض کر لیا

جائے کہ نمل کسی قبیلے کا نام تھا تو اس قبیلے کی خاتون کے لئے 'نملیہ' استعمال ہونا چاہئے نہ کہ 'نملتہ'۔ اور اگر وہ اپنے قبیلے کی سربراہ تھی تو اسے معرفہ آنا چاہئے جب کہ نملتہ نکرہ ہے۔ گویا کسی زاویے سے بھی اس لفظ کا یہ مفہوم لینا ممکن نہیں۔

پرویز صاحب کا یہ انداز تفسیر صرف سورۂ نمل ہی تک محدود نہیں' بلکہ انہوں نے پورے قرآن کو اسی انداز میں سیکھنے اور سمجھانے کی کوشش کی ہے۔ اس اسلوب تفسیر سے قرآن مجید کا انداز خطابت اس کے محاسن اور خبردار کر دینے والا منفرد انداز کہیں دکھائی نہیں دیتا اور انسان یہ سوچنے پر مجبور ہو جاتا ہے کہ کیا یہی وہ کلام ہے' جس نے انسانی تاریخ کا نقشہ بدل دیا تھا؟

سورۂ تکویر' قرآن مجید کے ان مقامات میں سے ہے' جہاں قیامت کا بیان ہوا ہے۔ اس سورہ میں اللہ تعالیٰ نے اس دن کا منظر کھینچا ہے' جس دن یہ نظام کائنات لپیٹ دیا جائے گا۔ یہاں قرآن کا انداز رونگٹھے کھڑے کر دینے والا ہے۔ اسے پڑھتے ہوئے ایک صاحب دل پر جو کیفیت طاری ہوتی ہے' الفاظ اس کو بیان کرنے سے قاصر ہیں۔ اللہ تعالیٰ انسان کو خبر کے انداز میں مخاطب کرتے ہیں:

اذا الشمس کورت o و اذا النجوم انکدرت o واذا الجبال سیرت o و اذا العشار عطلت o و اذا لوحوش حشرت o و اذا لبحار سجرت o و اذا النفوس زوجت o و اذا الموء دة سئلت o بای ذنب قتلت o و اذا الصحف نشرت o و اذا السماء کشطت o و اذا لجحیم سعرت o و اذا لجنة ازلفت o علمت نفس ما احضرت o (التکویر 1 تا 14)۔

''جب کہ سورج کی بساط لپیٹ دی جائے گی اور تارے بے نور ہو جائیں گے۔ پہاڑ چلا دیے جائیں گے اور دس ماہہ گابھن اونٹنیاں آوارہ پھریں گی۔ وحشی جانور اکٹھے ہو جائیں گے اور سمندر ابل پڑیں گے۔ جب کہ نفوس کی جوڑیں ملائی جائیں گی اور زندہ درگور کی ہوئی لڑکی سے پوچھا جائے گا کہ وہ کس گناہ پر ماری گئی! جب کہ اعمال نامے کھولے جائیں گے' اور آسمان کی کھال کھینچ لی جائے گی۔ جب کہ دوزخ بھڑکا دی جائے گی اور جنت قریب لائی جائے گی۔ تب ہر جان کو پتہ چلے گا کہ وہ کیا لے کر آئی ہے''۔

پرویز صاحب اس سورہ کا ترجمہ کرتے ہوئے رقم طراز ہیں:

''(کسی آنے والے دور میں' جب انسانوں کے خود ساختہ نظام تمدن و معاشرت کی جگہ قرآنی نظام لے لے گا تو اس وقت کی انقلابی کیفیات سے متعلق یوں سمجھو کہ) ملوکیت کا نظام لپیٹ دیا جائے گا اور ان کے اہالی موالی (چھوٹی چھوٹی ریاستیں) سب جھڑ کر نیچے گر جائیں گی۔ ان کا شیرازہ بکھر جائے گا۔ ان کی قوت ماند پڑ جائے گی اور پہاڑوں جیسے محکم امراء و رؤساء اپنی اپنی جگہ سے ہل جائیں گے اور جن ذرائع رسل و رسائل (مثلاً اونٹوں) کو اس وقت اتنی اہمیت دی جا رہی ہے' وہ سب بے کار ہو جائیں گے اور وحشی اور نامانوس قومیں بھی اجتماعی زندگی کی طرف آتی جائیں گی اور سمندروں میں آمدورفت کا

سلسلہ اتنا وسیع ہو جائے گا کہ ہر وقت بھرے بھرے دکھائی دیں گے اور ان کے کناروں کی بستیاں بھی بڑی آباد ہو جائیں گی اور اطراف و اکناف کی آبادیاں ایک دوسرے کے ساتھ ملتی جائیں گی۔ جب ان لڑکیوں کے متعلق جنہیں معاشرہ زندہ درگور کر دیتا ہے اور ان بے چاریوں کا پرسان حال کوئی نہیں ہوتا تو پوچھا جائے گا کہ انہیں بالآخر کس جرم کی پاداش میں ذبح کیا جاتا رہا (یعنی عورتوں کو ان کے حقوق دلائے جائیں گے) اور اخبارات و رسائل جگہ جگہ پھیل جائیں گے اور اجرام فلکی پر پڑے ہوئے پردے ایک ایک کر کے اٹھتے چلے جائیں گے (ان کے حالات دریافت کئے جائیں گے)۔''

''(تو اس وقت خدا کے قانون مکافات کا عمل تیز تر ہو جائے گا۔ کیونکہ اس وقت آخرالامر وہ نظام متشکل ہو جائے گا جس میں ہر معاملہ انصاف اور قانون کے مطابق طے پائے گا' لہٰذا اس کی رو سے) مجرمین کے لئے جہنم کے شعلے زیادہ تیزی سے بھڑک اٹھیں گے اور اس نظام کی پابندی کرنے والوں کے لئے جنتی معاشرہ قریب تر لایا جائے گا۔ یعنی اس وقت ہر شخص اپنے اپنے عمل کے نتائج اپنے سامنے بے نقاب دیکھے گا''۔ (مفہوم القرآن' جلد سوم' ص 1418-1419)۔

اگر سورہ تکویر کی آیات کا یہی مطلب لیا جائے جو ''مفہوم القرآن'' میں بیان کیا گیا ہے تو قرآن مجید کے بارے میں کسی حسن ظن کا امکان باقی نہیں رہتا۔ قرآن مجید کی ان آیات میں اتنا اثر ہے کہ یہ ایک حساس آدمی کی قلبی کیفیات کو تبدیل کر دیتی ہیں۔ جرم کی طرف بڑھتے قدم رک جاتے ہیں۔ انسان نیکی کی طرف پیش قدمی کرتا ہے اور ان جملوں کا اثر قاری کی روح تک میں اتر جاتا ہے۔ لیکن پرویز صاحب کا ترجمہ درست تسلیم کر لینے سے' پڑھنے والے کی حالت میں کوئی تبدیلی واقع نہیں ہوتی۔ اس کے دل کی دنیا بدلتی ہے اور نہ اس کا اثر اس کے اعمال پر ہوتا ہے اور آدمی سوچتا ہے کہ کیا یہی وہ کلام ہے جسے سن کر لبید نے شعر کہنا ترک کر دیا تھا!

پرویز صاحب کے اس ترجمے سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ کچھ باتوں سے' دانستہ دامن بچا کر گزرنا چاہتے ہیں۔ وہ قرآن کے منہ میں اپنی بات ڈالنا چاہتے ہیں۔ بلاشبہ یہ تفسیر بالرائے کی بدترین مثال ہے۔

بعض لوگوں کے نزدیک پرویز صاحب کے فکر میں پائی جانے والی سب سے بڑی ضلالت ''انکار حدیث'' ہے۔ لیکن' ہمارے نزدیک' انہوں نے قرآن فہمی کے جو اصول متعین کئے ہیں' وہی ان کی گمراہی کا بنیادی سبب ہیں۔ قرآن مجید سے غلط استدلال کی وجہ سے انہوں نے بے شمار چیزوں کا انکار کیا۔ حدیث' معجزہ' جنات وغیرہ کا شمار اسی فہرست میں ہوتا ہے۔ اگر وہ قرآن کو صحیح اصولوں کی بنیاد پر سمجھتے تو انہیں ان سب کا ثبوت قرآن ہی سے مل جاتا۔ قرآن میں اللہ تعالیٰ کی قدرت اور منصب رسالت کو ایک واضح اسلوب میں بیان کیا گیا ہے۔ ان تصورات کو جان لینے کے بعد ان چیزوں کے انکار کے لئے کوئی جواز باقی نہیں رہتا۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

ابو منیب راشد

فکر پرویز کی اصل قدر و قیمت

تمہید

ہمارے نزدیک جناب پرویزؒ کے فکر میں پاکستان کے الجھے ہوئے گھمبیر مسائل اور معموں ہی کا حل نہیں بلکہ ہمیں یقین ہے کہ اس میں کل کی کل نوع انسانی (خواہ وہ مشرقی ہو یا مغربی) کے مسائل کا حل پایا جاتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ فکر پرویز کی خصوصیت یہ ہے کہ اس میں عقل انسانی اور کتاب اللہ کے مابین صحیح ترین ادراک و امتزاج پایا جاتا ہے۔ اس فکر میں ہمارے اسلاف کی اعلیٰ فکری روایات کا تسلسل بھی ہے اور اس منزل کے آثار و شروعات بھی کہ جہاں پر نوع انسان نے پہنچ کر انجام کار اپنے شرف و مجد اور آسودگی و بہبودیٔ جسم و جان سے آراستہ و پیراستہ ہونا ہے۔ یہی وہ فکر ہے کہ جو ایک طرف تخلیق حیات و کائنات کے سربستہ رازوں کو آشکارا کرتی ہے۔ تو دوسری طرف انسانی ذات اور انسانی سوسائٹی کے ان نصب العینی تقاضوں کی تسکین و تشفی کا وافر سامان مہیا کرتی ہے کہ جن کے مہیا نہ ہونے کی وجہ سے روس جیسے عظیم پرولتاریہ کی شان و شوکت پارہ پارہ ہو چکی ہے اور جس کے نہ ہونے کی وجہ سے امریکی استعمار کبھی بھی ورلڈ آرڈر کے عظیم خواب کو شرمندۂ تعبیر نہیں کر سکے گا اور کسی حد تک اس نے اس حوالے سے کامیابی حاصل کر بھی لی تو ڈھلتی چھاؤں اور ڈوبتے سورج سے زیادہ کچھ نہ ہوگی۔ اصل حقیقت یہ ہے کہ کُل نوع انسانی کا اجتماع عظیم نیو ورلڈ آرڈر کا انسانی خواب تو ضرور شرمندۂ تعبیر ہوگا کیونکہ یہ خلاق و علیم اللہ تعالیٰ کا ٹھہرایا ہوا نصب العین ہے اور حیات و کائنات کے عظیم سلسلے بتدریج اسی کی طرف خراماں خراماں نوع انسانی کو لئے جا رہے ہیں۔ لیکن اس حسین خواب کو شرمندۂ تعبیر کرنے کے لئے جن خود آگاہ و خدا مست انسانوں نے فکری و نظریاتی جہاد عظیم کیا ہے' ان کے فکری و نظریاتی ورثہ سے صرف نظر کرتے ہوئے یہ ادھورا خواب شرمندۂ تعبیر نہیں ہو سکتا۔ اس خواب کو حقیقت کا روپ عطا کرنے کے لئے اللہ تعالیٰ کی مشیت قاہرہ سے ماہ رمضان کی لیلۃ القدر میں پاکستان کا قیام ہوا ہے۔ قائداعظم محمد علی جناحؒ نے اس کے لئے عملی جدوجہد کا فریضہ سرانجام دیا ہے۔ حکیم الامت علامہ محمد اقبالؒ نے اس کے لئے فلسفیانہ و مابعد الطبیعی بنیادیں فراہم کی ہیں اور جناب پرویزؒ نے ان علمی و نظریاتی مشکلات کو حل کرنے کی علمی و نظریاتی راہنمائی کی ہے' جو دین سماوی کے پاکستان میں نفاذ و قیام کے راستے میں سنگ گراں کے طور پر حائل ہیں۔ پاکستان آج جن جن فکری و نظریاتی الجھنوں کا شکار ہے' اس کی اصل وجہ یہی ہے

کہ یہاں کے حکمرانوں نے دیدہ دانستہ طور پر بانی پاکستان محمد علی جناحؒ، مفکر پاکستان علامہ محمد اقبالؒ اور مفکر قرآن جناب پرویزؒ صاحب کی نصب العینی جدوجہد سے انحراف اختیار کئے رکھا ہے لیکن اب آہستہ آہستہ وہ نوجوان نسل پروان چڑھ چکی ہے جس نے ان تینوں منبعوں سے جی بھر کر کسب فیض اور اقتباس ضیاء کیا ہے۔ اب پاکستان کے اصل وارث بیدار ہو رہے ہیں۔ آج کا دور، دورِ فکر پرویز ہے۔ فلہٰذا اسے گمراہی قرار دینے والے افراد اور اداروں کا فکری و نظریاتی تعاقب کرنا ہمارا مقدس فریضہ ہے۔ اسی فریضہ کی ادائیگی کے لئے یہ چند اوراق پیش خدمت ہیں۔ وباللہ التوفیق۔

پرویز صاحب کی اصل غلطی: ''پرویز کی اصل گمراہی'' اور ان کے گمراہ ہونے کے آج جو عنوان قائم کئے جا رہے ہیں، ان کا اپنا ایک پس منظر ہے۔ انسانی ظن و گمان اور خود ساختہ روایات کے قصر مشید دھڑام سے گرتے نظر آ رہے ہیں۔ پرویزؒ صاحب کے ہاں جن جن امور کو اصل گمراہی ٹھہرایا جا رہا ہے یہ گمراہی نہیں ہیں۔ ''پرویز صاحب کی اصل غلطی'' یہ نہیں ہے بلکہ ان کی اصل غلطی یہ ہے کہ انہوں نے اپنی زندگی کا ایک ایک سانس اور اپنے آرام و متاع حیات کا ایک ایک ذرہ خدمت کتاب اللہ کے لئے وقف کئے رکھا۔ وہ پرویز کہ جس نے اکابر و اسلاف پرستی سے جب اپنا دامن چھڑا لیا، جب اس نے تقلیدی اعمی سے کام لینے سے انکار کر دیا، جب اس نے عجمی اسلام اور ملوکیت زدہ مذہب کی اصل حقیقت کو پہچان لیا، جب اس پر مذہب اور دین کے امتیازات روز روشن کی طرح عیاں ہو گئے، جب اس نے اطاعت رسولؐ کے قرآنی مفہوم و مدلول کا سراغ لگا لیا، جب اس نے قرآنی دین، نبوی اسلام اور حیات و خرد افروز مسلک حیات سے آگاہی حاصل کر لی، جب اس نے ملوکیت کے استبداد (فرعونیت) مذہبی پیشوائیت کے جبر و اکراہ (ہامانیت) اور سرمایہ داریت و جاگیرداریت کے ظلم و استحصال (قارونیت) کو اچھی طرح پہچان لیا، تو اس نے تن تنہا ان کے خلاف فکری و نظریاتی جنگ کا اعلان ہی نہیں کیا، بلکہ اپنی پوری زندگی کو اسی جہاد عظیم کے لئے وقف کر دیا۔ وہ شخص کہ جو اپنی ذات میں ایک انجمن تھا۔ وہ سرمایہ شکن اور طاغوت کش دعوت و پروگرام کا نقیب تھا۔ وہ کسی سرمایہ دار یا جاگیردار کے وظیفوں پر پلنے والا نہ تھا لیکن اس نے اللہ تعالیٰ کی تائید و نصرت اور اپنی ذات اور اپنے مشن کی صداقت اور اپنے مخلص رفقاء کے حسن تعاون سے آسمانی قرآنی قندیل کو روشن رکھا اور وہ اپنے خون جگر سے اس مزرع حیات کی آبیاری کرتا رہا۔ اسے اس قرآنی شمع کو فروزاں رکھنے سے نہ تو ملوکیت کا استبداد روک سکا اور نہ ہی مذہبی پیشوائیت کے مشرقی و مغربی نمائندوں کے فتاویٰ ہائے کفر و ارتداد ہی اس کے پائے استقامت میں کوئی ادنیٰ ترین لغزش پیدا کر سکے۔ ہمیں کتنے ہی وہ معرکے یاد ہیں کہ مذہبی پیشواؤں نے دیال سنگھ کالج کے لیکچر ہال اور وائی ایم سی اے ہال جیسے مقامات پر شور و غل پیدا کر کے اس کی قرآنی آواز کو دبانے کی کوشش کی لیکن وہ کوہ استقامت پورے جاہ و جلال کے ساتھ قرآنی آواز کا ارتعاش پیدا کرتا رہا۔ حتیٰ کہ جن دنوں مذہبی پیشواؤں کے فتاویٰ ہائے کفر و ارتداد کے چھپ جانے کی وجہ سے فضا میں کافی تکدر پایا جاتا تھا، اس وقت بھی کئی اہل درد احباب کا تقاضا ہوتا تھا کہ درس قرآن کو فی الحال روک دیا جائے۔ لیکن 25 بی گلبرگ کا

مقدس ماحول گواہ ہے کہ پرویزؒ صاحب نے اس حوالے سے درس کا ناغہ کرنا بھی گوارا نہیں کیا تھا۔ پس آج تک وہ شاھد ان حال بطور گواہ موجود ہیں جو ان دروس میں شریک ہوکر اپنی قرآنی تشنہ لبی کا سامان اور اپنے قرآنی کام و دہن کا متاع گرانمایہ حاصل کیا کرتے تھے۔

پس پرویزؒ صاحب کی اصل غلطی یہ ہے کہ وہ حاکمیت قرآن کے داعی تھے۔ وہ تحریک رجوع الی القرآن کے نقیب تھے۔ وہ نظام ربوبیت کے ترجمان تھے۔ طاغوتی تثلیث کے مظاہر یعنی فرعون' ہامان اور قارون کے محلات اور ان کے مصنوعی جاہ و جلال کو خس و خاشاک کی طرح بہالے جانے والے تھے۔ وحی قرآن کے اپنانے میں نوع انسانی کی نجات و سعادت کے قائل تھے۔ صرف اتنی ہی بات نہیں بلکہ اس سے بڑھ کر ان کا جرم یہ ہے کہ انہوں نے قرآن فہمی کی ایسی پختہ و پائیدار شاہراہِ حیات کی نشان دہی کی ہے کہ جس کے سنگ ہائے میل کے انوار و تجلیات سے ظلمت کدہ آدمیت بقعۂ نور بنا چاہتا ہے۔ آپ نے اپنی نہ تھکنے والی طبیعت اور اپنی ذات میں اللہ تعالیٰ کی عطا کردہ بے پایاں صلاحیتوں سے کام لے کر سلسلۂ معارف القرآن۔ نظام ربوبیت۔ لغات القرآن۔ مفہوم القرآن۔ مطالب الفرقان۔ فردوس گم گشتہ۔ سلسبیل۔ ابلیس و آدم۔ کتاب التقدیر۔ انسان نے کیا سوچا۔ اسلام کیا ہے۔ تبویب القرآن۔ بہار نور۔ جہان فردا۔ اسلام اے چیلنج ٹو ریلجن۔ معراج انسانیت۔ شاہکار رسالت۔ جیسی گرانقدر و عہد ساز کتابوں کی شکل میں فکر و بصیرت کی وہ گرانمایہ میراث چھوڑی ہے کہ جو تا ابد قافلہ ہائے طلبائے قرآن کے لئے حدی خوانی کا فریضہ انجام دیتی رہے گی۔ کوئی شخص یہ گمان نہ کرے کہ ہم طلبائے قرآن جناب پرویزؒ صاحب کو معصوم مانتے ہیں یا ان کے بتائے ہوئے مفاہیم اور سمجھائے ہوئے مطالب کو وحی یا وحی کا بدل مانتے ہیں۔ حاشا وکلا نہ ہمارا یہ اعتقاد ہے اور نہ ہی کوئی پرویزؒ صاحب سے مستفید ہونے والا عالم یا عاصی ایسے گمان میں مبتلا ہوسکتا ہے اور اگر کوئی ایسا گمان کرتا بھی ہے تو ہم ہی اس سے بیزار نہیں بلکہ خود پرویزؒ صاحب بھی اس سے بری الذمہ ہیں۔ کیونکہ وہی لغات القرآن کہ جس کا جناب ندیم نے حوالہ تو دیا ہے لیکن جس کا انہوں نے امعان و تدبر کے ساتھ قطعاً مطالعہ نہیں کیا' اسی لغات القرآن کی چوتھی جلد کے آخری صفحہ پر اللہ تعالیٰ کے حضور تشکر و امتنان کا اظہار کرتے ہوئے پرویزؒ صاحب فرماتے ہیں کہ ''بہرحال یہ ایک انسانی کوشش ہے۔ جس میں سہو و خطا کا ہر وقت امکان ہوتا ہے۔ میں نے قرآن فہمی کے سلسلہ میں یہ ایک نئی طرح ڈالی ہے' دیگر اربابِ ذوق اور علم دوست حضرات مزید غور و تدبر سے اسے بہتر بنا سکتے ہیں''۔

اتنا ہی نہیں بلکہ پرویزؒ صاحب اس سے بڑھ کر ارشاد فرماتے ہیں کہ:

> ''قرآنِ کریم میں غور و فکر کا سلسلہ تو کبھی ختم ہی نہیں ہوسکتا اس لئے اس باب میں کسی انسان کا قول بھی حرفِ آخر نہیں کہلا سکتا۔''

گویا پرویزؒ صاحب نے جو کچھ کہا ہے وہ نعوذ باللہ نہ تو وحی ہے اور نہ ہی اسکا بدل' البتہ وہ قرآن فہمی کے سلسلہ میں ایک ایسی کوشش ہے کہ جس کی قرون مشہود لھا بالخیر کے بعد صدیوں تک کوئی مثال نہیں ملتی۔ ہم سے قریب ترین عہد میں شاہ ولی اللہ دہلوی کے ہاں اس کے آثار ملتے ہیں۔ سرسید احمد خانؒ نے اس مسلک کے لئے شاندار خدمات انجام دی ہیں۔

علامہ محمد اقبالؒ نے اپنے اشعار و مکاتیب میں اس طرف مثبت اشارات کئے ہیں۔محترم پرویز صاحب نے اسے ایک مستقل بالذات فن کے طور پر متعارف کرایا ہے۔ان کا قائم کردہ یہ سلسلہ انشاء اللہ اس وقت تک جاری رہے گا جب تک کہ یہ ظلمت کدۂ ارض' نظامِ ربوبیت وعبودیت کے انوار وتجلیات سے بقعۂ نور نہیں بن جاتا اور اس طرح وہ آدم جو اپنی فردوسِ گم گشتہ کی تلاش میں نامعلوم زمانوں سے ٹھوکریں کھاتے ہوئے دوبارہ اس کے حصول و یافت کے لئے سرگرداں ہے دوبارہ اپنے حسنِ عمل اور حسنِ انتخاب' سعیِ پیہم اور جدوجہد نا اختتام کے نتیجہ میں اس کے خزاں نا آشنا ثمرات اور اس کے حسنِ لازوال سے متمتع ہونا شروع نہیں کر دیتا۔

پرویزؒ صاحب اور ان کی فکری بلندی: جہاں تک پرویزؒ صاحب کی فکری ونظریاتی بلندی کا تعلق ہے' تو اس کے لئے اتنا کہنا کافی ہے کہ ان کے فکری ونظریاتی ترفع کو وہ لوگ بھی خراج عقیدت ادا کر رہے ہیں کہ جنہوں نے دورِ حاضر کے افکار وتصورات کا نہایت ژرف نگہی اور جانکاہی سے مطالعہ ہی نہیں کیا بلکہ ان کا ناقدانہ جائزہ بھی لیا ہے۔اسی حوالے سے ہم یہاں اپنے ملک کے ایک جلیل القدر ادیب' شاعر اور مفکر کی رائے درج کرنا مناسب خیال کرتے ہیں۔ جناب ڈاکٹر خیال امروہوی پرویزؒ صاحب کے حوالے سے تحریر کرتے ہیں کہ وہ (راقم) اپنی افتادِ طبع' مذاقِ تحقیق' سائنٹفک تفہیم اور جدلی منطق پسندی کے باوجود جناب غلام احمد پرویز کو عصرِ حاضر کا مستند ترین مفسرِ قرآن اور نادر محقق تصور کرتا ہے اور علی الاعلانیہ کہہ سکتا ہے کہ لغات القرآن' انسان نے کیا سوچا' تبویب القرآن اور نظام ربوبیت' جیسی تخلیقات کے بعد قرآن حکیم صرف دم و درود تک محدود نہیں رہ جاتا' بلکہ حکمت و دانش کے مرقع اور دستور حیات کی صورت میں سامنے آتا ہے۔ چنانچہ قرآنی فرمودات کی معاشرتی زندگی سے تطبیق اور صدیوں قبل کے الوہی اور مابعد الطبعی تار عنکبوت سے انسان کو نجات دلانے میں سرسید احمد خاں کے بعد اگر کسی شخصیت کی ضرورت تھی' تو وہ جناب غلام احمد پرویز ہی کی کہی جاسکتی ہے''۔(نئی سوچ' صفحہ نمبر 73 از ڈاکٹر خیال امروہوی' شائع کردہ کلاسیک دی مال لاہور)۔

اب آیئے جناب ندیم اور ان کے رشحاتِ قلم وفکر کی جانب کہ یہ دیکھیں کہ انہوں نے جناب پرویز صاحب کے بارے میں کیا کیا گوہر افشانیاں کی ہیں!

مقالے کے اختتام پر ارشاد ہوتا ہے:

''بعض لوگوں کے نزدیک پرویز صاحب کے فکر میں پائی جانے والی سب سے بڑی ضلالت انکار حدیث ہے۔لیکن ہمارے نزدیک انہوں نے قرآن فہمی کے جو اصول متعین کئے ہیں وہی ان کی گمراہی کا بنیادی سبب ہیں۔قرآن مجید سے غلط استدلال کی وجہ سے انہوں نے بے شمار چیزوں کا انکار کیا ہے۔ حدیث' معجزہ' جنات وغیرہ کا شمار اسی فہرست میں ہوتا ہے۔اگر وہ قرآن کو صحیح اصولوں کی بنیاد پر سمجھتے تو انہیں ان سب کا ثبوت قرآن ہی سے مل جاتا۔ قرآن میں اللہ تعالیٰ کی قدرت اور منصب رسالت کو ایک واضح اسلوب میں بیان کیا گیا ہے۔ان تصورات کو جان لینے کے بعد ان چیزوں کے انکار کا کوئی جواز باقی نہیں رہتا۔'' (اشراق' ستمبر 90' صفحہ 55)۔

اس عبارت میں جو تعلّی اور جس بڑے پن کا اظہار پایا جاتا ہے۔ اسے ہر قلب حساس بہت اچھی طرح جان سکتا ہے۔ پھر اس بیمار ذہنیت کا اظہار اس شمارے کے ٹائٹل کے صفحہ پر بھی بایں انداز ہوا ہے کہ ''پرویز صاحب کی اصل غلطی'' وغیرہ۔

اب مناسب تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ ہم ان اصولوں کا ذکر یہاں ذرا تفصیل سے کرتے کہ جنہیں پرویزؒ صاحب نے قرآن فہمی کے حوالے سے اپنے پیش نظر رکھا ہے اور پھر جناب ندیم سے سوال کرتے کہ وہ متعین طور پر بتائیں کہ وہ ان میں سے کس کس کو سب سے بڑی ضلالت قرار دینے کی جرأت و جسارت کرتے ہیں اور اسی طرح ہم ان اصولوں کی جانب بھی ہلکا سا تنقیدی اشارہ کر دیتے کہ جو بقول' ان کے استاد امام امین احسن اصلاحی صاحب نے اپنے پیش نظر رکھے ہیں اور جنہیں بروئے کار لا کر انہوں نے بقول ان کے ان مداحوں کے ''تدبر قرآن'' جیسا وہ شاہکار جنم دیا ہے کہ جو خود کئی ایک تضادات اور فروگذاشتوں سے مالا مال ہے۔ نیز ہم بتاتے کہ ان صحیح اصولوں پر کاربند ہونے والے ''افلاطونِ وقت'' نے حدیث' معجزے اور جنات کے بارے میں جو جو عجوبہ کاریاں کی ہیں وہ کہاں تک اکابرین سلف کے منہاج سے مطابقت رکھتی ہیں۔ لیکن یہ بات ظاہر ہے کہ اس صورت میں ہمارا یہ مقالہ بے حد طویل ہو جائے گا جو شائد ماہنامہ کے صفحات اور اس کی گنجائش سے بھی باہر ہو جائے۔ اس لئے فی الحال ہم انہیں نکات تک اپنے آپ کو محدود رکھیں گے کہ جنہیں جناب ندیم نے اپنے ترکش کے تیروں کا نشانہ بنانے کی سعی لاحاصل کی ہے۔

I- جناب ندیم نے پرویزؒ صاحب کے اندازِ استدلال کا مذاق اڑانے کے لئے اور طلبائے قرآن کے سامنے انہیں (کودک) نادان کے طور پر پیش کرنے کے لئے چند ایک لچر اور لایعنی مثالوں کا سہارا لیا ہے۔ محترم کا مذاق اڑاتے ہوئے یہ یوں گوہر افشانی کرتے ہیں کہ ''اگر کوئی شخص شوربا (جو کہ سالن ہے) کے لفظ کی تحلیل کرتے ہوئے اسے شور اور با کا مرکب قرار دے اور اس کا معنی نمکین پانی قرار دے' تو کیا اس کا یہ استدلال قابل قبول ہوگا۔ (ص 47) جواب ہے' ہرگز نہیں۔ کیونکہ اس حوالے سے سب سے پہلے تو سوال یہ ہوگا' کہ اردو یا ہندی زبان میں یا جس زبان کا بھی یہ لفظ ہے' اس میں اس کے اصل معنی کیا ہیں۔ نیز اس کے بارے میں یہ جاننے کی کوشش کی جائے گی کہ یہ لفظ مرکب ہے یا مفرد یا یہ لفظ عام ہے یا خاص یا اصطلاح' اگر یہ ایک خاص اصطلاح ہے تو یہ کس فن کی اصطلاح ہے اور اصحاب فن نے اس کی اپنے ہاں کیا تعریف وضع کر رکھی ہے۔ پس ان امور کا جواب دیئے بغیر ہم شوربا اور اس جیسے دوسرے الفاظ کے بارے میں کسی بھی رائے کا اظہار کرنے سے قاصر رہیں گے''۔ لیکن اب سوال یہ ہے کہ جناب پرویزؒ نے لغات القرآن یا مفہوم القرآن میں کوئی ایسی لچر و بے بنیاد بات کہی ہے تو اسے زیر بحث لانا چاہئے تھا۔ پس کسی ایسی مثال کو ان کے پیدا کردہ لٹریچر سے سامنے لائے بغیر مجرد اس طرح کی لچر مثالیں گھڑ کر پیش کرنا اور پھر اسے پرویزؒ صاحب کی طرف منسوب کرنا یقیناً بدنیتی اور طعن و استہزاء کی وہ بدترین مثال ہے کہ جس کی جتنی بھی مذمت کی جائے کم ہے۔ سوال یہ ہے کہ اہل زبان جب الفاظ وضع کرتے ہیں اور کسی زبان کے ارباب فن جب وضع اسماء یا اصطلاح سازی کا فریضہ انجام دیتے ہیں' تو کیا ان کے سامنے عقل و منطق کی کوئی منہاج نہیں ہوتی۔ کیا وہ اناپ شناپ ایسے ہی

اس مرحلے کو طے کر لیتے ہیں اور اندھا دھند طریقہ سے ان کا منہاج قبولیتِ عامہ اور رواج عام کی سند حاصل کر لیتا ہے۔ یقیناً ایسا نہیں ہے۔ ذرا اس شوربا کے لفظ ہی کی طرف آیئے جیسا کہ ندیم صاحب نے کہا ہے کہ شوربا کا از روئے لغت معنی ہے۔ نمکین پانی۔ براہِ کرم اردو زبان کا کوئی سا لغات اٹھا کر دیکھئے۔ فرہنگ آصفیہ۔ نور اللغات۔ لغات نول کشور' نہیں تو کم از کم فیروز سنز کا فیروز اللغات اردو ہی اٹھا کر دیکھ لیجئے۔ کیا کسی ایک نے بھی شوربا کا معنی مجرد نمکین پانی لکھا ہے۔ اگر ایسا ہے تو آپ سچے ہیں اور آپ کی بات بھی سچی ہے اور آپ کا استدلال قوی ہے۔ لیکن اگر کسی لغات میں بھی ایسی بے تکی بات نہیں ہے تو آپ کو اپنی اس جرأت و جسارت پر کچھ تو ندامت محسوس کرنی چاہئے۔

ہاں برادرم! جایئے اور دنیا جہاں کے اصحاب فن اور عقلائے وقت کی رائے لیجئے اور ذرا ان سے پوچھئے کہ کیا جس چیز پر شوربا کا اطلاق کیا جاتا ہے۔ خواہ وہ پتلا ہو یا گاڑھا۔ خواہ وہ مرغ کے گوشت کا ہو یا چنے کی دال کا۔ کیا وہ میٹھا ہوسکتا ہے۔ میٹھے محلول یا سیال شیریں کو کبھی بھی شوربا نہیں کہا جائے گا۔ شوربا کا لفظ جب بھی بولا جائے گا۔ اس میں نمکینی کا پایا جانا از بس ضروری اور اٹل ہے۔ لہٰذا آپ میں طاقت ہے تو اس کا انکار کر کے دیکھئے۔ ابھی آپ کو اپنی قدر و قیمت کا اندازہ ہو جائے گا۔

ہاں جناب ندیم صاحب! آیئے ذرا اس نکتہ پر غور کریں کہ جب ہم کسی چیز کو آبجو (جو کا پانی) یا عرق گلاب کہتے ہیں تو کیا وہ گندم کا پانی یا سورج مکھی کے پھولوں کا عرق ہوسکتا ہے۔ ہرگز نہیں۔ ہر زبان میں اسماء سازی کا کام اور اصطلاح سازی کا فن نہایت حکمت و دانش سے پایۂ تکمیل کو پہنچتا ہے۔ مزید برآں یہ کہ اگر اصطلاح سازی میں اربابِ فن جلد بازی یا کسی کوتاہی کا مظاہرہ کرتے ہیں تو اس کا خمیازہ انہیں ضرور بھگتنا پڑتا ہے۔ اور ایسے الفاظ زبانوں میں ثقل پیدا کرنے کا باعث بن جاتے ہیں۔ اس طرح ایسے الفاظ کبھی بھی عوام میں چلن یا رواج عام کا مقام حاصل نہیں کر پاتے۔ حکومت پنجاب کے شعبہ زبان دفتری کی وضع کردہ اصطلاحات کا حال جا کر معلوم کر لیں حالانکہ ان کو وضع کرنے کے دوران انتہائی بالغ نظر اور جہاندیدہ بزرگوں کی خدمات حاصل کی گئی تھیں۔ پس آپ سے ہماری گذارش ہے کہ شوربے جیسی مثالوں کا سہارا لے کر قرآن فہمی کی اس شاندار فکری جدوجہد کا استخفاف نہ کریں کہ ہوسکتا ہے کہ کل کلاں آپ کو نہیں تو آپ جیسے دوسرے احباب اور آپ کے بعد آنے والی نسلوں کو لازماً اس سے کسبِ فیض اور اقتباسِ ضیاء کرنا ہے اور بس۔

II- اسی طرح کی ایک دوسری مثال ٹیلی ویژن کی دی ہے (ص 47) سوال یہاں بھی وہی ہے کہ اصحاب فن اور ماہرین زبان نے جس چیز یا آلہ کا نام ٹیلی ویژن قرار دیا ہے' کیا یہ اسم بامعنی ہے یا نہیں۔ یعنی یہ کہ ٹیلی ویژن کے لفظ میں انتقال مناظر کا مفہوم پایا جاتا ہے یا نہیں۔ کیا ٹیلی ویژن کے لفظ سے جو مفہوم بر بنائے لغت حاصل ہوتا ہے وہ صحیح ہے یا نہیں۔ کیا بھلا ٹیلی ویژن کے لفظ کے ابتدائی و بنیادی مفہوم تک رسائی حاصل کرنے کے لئے ہمارے لئے واجب ہے کہ ہم انگریز قوم کی اس وقت کی تاریخ کو کھنگال لیں کہ جب اس کے اندر ابھی نشأۃ ثانیہ کے کوئی آثار تک ظاہر نہ ہوئے تھے۔ جب وہ اپنے دورِ وحشت و بربریت اور ظلم و جہالت کی اتھاہ تاریکیوں میں ڈوبی ہوئی تھی۔ کیا بھلا ٹیلی ویژن

کے مفہوم کو پانے کے لئے ہمارے لئے واجب ہے کہ ہم شیکسپیئر، ورڈز ورتھ، ٹینی سن، شیلے اور بائیرن جیسے انگریزی زبان کے قدیم و جدید شعراء کے دواوین کو کھنگال مارنے میں اپنے شب و روز ضائع کر دیں۔ اگر جواب نفی میں ہے اور یقیناً نفی میں ہے تو سوال یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی کتاب لاریب کا مطالعہ کرنے کے لئے ہم جاہلی و محضری شعراء عرب کے ان دواوین کو پڑھنے پر کیسے مجبور ہو سکتے ہیں کہ جن کے اصلی یا جعلی ہونے کا بھی ہم فیصلہ نہیں کر سکتے۔ مقام افسوس ہے کہ وہ کتاب عظیم کہ جس کے مصنف علام (اللہ تعالیٰ) کا دعویٰ ہے کہ قرآن حکیم اور شعر و شاعری کے مابین وہی نسبت و تناسب ہے جو نور و ظلمت میں ہے (36/69) جس کا اعلان ہے کہ اس نے اپنے رسولؐ کو شعر و شاعری کی تعلیم دی ہی نہیں کیونکہ وہ اس کی شان عظیم سے کوئی لگا ہی نہ کھاتی تھی (36/69) اس کتابِ لازوال اور منبع حکمتِ بے مثال کو عربی جاہلیت کے ادب جاہلی اور پھر وہ بھی اس کے جاہل شعراء کے دواوینِ مکذوبہ و مصنوعہ کا محتاج قرار دینا بدترین ظلم نہیں تو اور کیا ہے؟ کیا یہ بے ہودہ و ناروا جسارت نہیں ہے کہ جس کی جتنی بھی مذمت کی جائے وہ کم ہے۔ ہم انشاء اللہ آگے چل کر ان نمونہ ہائے فکر و فن کو اپنے قارئین کے سامنے لائیں گے جو ان مشتاقانِ شعراء جاہلیت نے قرآنِ حکیم کی نورانی محفل میں ناخواندہ مہمان کے طور پر لانے کی کوشش کی ہے۔

حقیقت و مجاز: حقیقت و مجاز کے استعمالات پر گفتگو کرنے کے دوران مجاز کے تعین میں جناب ندیم صاحب نے لغت کے تصرف سے معانی کے بگڑ جانے کے حوالے سے جو مثال دی ہے اور اس مثال سے جو مفہوم انہوں نے اخذ کیا ہے، حقیقت یہ ہے کہ اس کی جس قدر بھی داد دی جائے کم ہے۔ عقل و حکمت کے تمام دفاتر اس مثال اور اس سے اخذ کردہ مفہوم کو اپنے اندر جذب کرنے اور محفوظ رکھنے کے لئے بے تاب ہیں۔ مجاز کے حوالے سے اس کی مثال دیتے ہوئے ارشاد فرمایا گیا ہے کہ اگر کوئی کہے کہ ''میں ساجد اور عابد کے ساتھ بازار گیا'' تو جملہ خود تعین کر رہا ہے کہ ساجد اور عابد معرفہ ہیں اور ان سے مراد خاص افراد ہیں۔ یہ مفہوم مراد لینے سے جملے کا مدعا بالکل واضح ہے۔ لیکن اگر جملے کی ساخت اور اس کے ظاہری مفہوم کو نظر انداز کر کے لغت کی رو سے سمجھنے کی کوشش کی جائے تو کچھ اس قسم کی صورت حال سامنے آئے گی۔ ساجد سجدہ سے اسم الفاعل ہے اور اس کے معانی خاکساری کرنے والے کے ہیں۔ اس طرح عابد کا مطلب حریص ہوتا ہے۔ لہٰذا جملے کا مطلب ہوگا۔ میں ایک خاکسار اور ایک حریص آدمی کے ساتھ بازار گیا۔ لغت کی رو سے تو یہ مفہوم صحیح ہے۔ لیکن کیا جملے میں یہی بات کہی گئی ہے؟ ظاہر ہے کہ نہیں۔ لہٰذا کسی جملے یا عبارت کا مفہوم متعین کرتے ہوئے ضروری ہے کہ الفاظ کا حقیقی و مجازی استعمال پیش نظر ہو۔'' (صفحہ نمبر 49)۔

اس طویل اقتباس کو ذرا توجہ سے پڑھیں اور غور کریں کہ جناب ندیم صاحب نے کیا کہا ہے اور کس سند یا شخصیت کے بھروسے پر اتنی ناروا اور غیر معقول بات تحریر کر دی ہے۔ اب غور کیجئے۔

(1) ندیم صاحب کہتے ہیں کہ ساجد اور عابد اسمائے معرفہ ہیں۔ لہٰذا انہیں اسمائے نکرہ کے طور پر نہیں لینا چاہئے۔ یہ بات بالکل صحیح ہے۔ اسم علم کو نکرہ بنانا یا کسی اسم نکرہ کو علم قرار دینا یقیناً ایک ناروا بات ہے اور یہ بات بھی صحیح ہے کہ

اسمائے اعلام کا تعین وتشخص بنیادی طور پر لغت سے نہیں بلکہ معرف (معرفہ بنانے والا) اور واضع (اسم کو وضع کرنے والا) کے توسط سے کیا جانا چاہئے۔ البتہ اگر یہ اسماء مشتق ہوں تو ابتدائی طور پر ان میں ان کے اصل فعل یا مصدر کے مفہوم کی جھلک کسی نہ کسی صورت میں ضرور پائی جاتی ہے۔ یا کم از کم اس کی تمنا ضرور ہوتی ہے اگر چہ وہ بالفعل موجود نہ بھی ہو۔ لیکن سوال یہ ہے کہ اس مثال کو بیان کر کے جناب ندیم' پرویزؒ صاحب کے بارے میں کیا کہنا چاہتے ہیں۔ کیا وہ اس امر کو ثابت کر سکتے ہیں کہ پورے قرآن میں کسی ایک اسم علم کو پرویزؒ صاحب نے اسم نکرہ بنا دیا ہو یا کسی بھی اسم نکرہ کو اسم علم ٹھہرا دیا ہو۔ جہاں تک ہم نے پرویزؒ صاحب کو سنا اور پڑھا ہے۔ ہمیں تو ایسی کوئی ایک مثال بھی نہیں ملی۔ اگر ندیم صاحب کو پرویزؒ صاحب کے ہاں کوئی ایک بھی ایسی بے ہودہ ولایعنی مثال ملی ہو تو وہ ہمارے سامنے پیش کریں تا کہ اس پر غور وخوض کر کے ہم بات کو آگے بڑھا سکیں۔

(2) یہ نکتہ بھی غور طلب ہے کہ جب کوئی باپ اپنے بیٹے کا نام عابد یا ساجد رکھتا ہے تو کیا اس کی یہ تمنا نہیں ہوتی کہ اس کا یہ بیٹا' احکام الٰہیہ کی اطاعت کرنے والا (ساجد) اور ان کی محکومیت اختیار کرنے والا (عابد) ہو۔ لہٰذا ہر وہ لفظ کہ جو کسی مادہ سے نکلا ہو خواہ اسے علم بھی بنا لیا جائے تو اس صورت میں بھی لغوی مفہوم اور ابتدائی معنی کسی نہ کسی شکل میں ضرور موجود رہتا ہے۔ لہٰذا یہ کہنا کہ لغات سے مفاہیم کے اخذ کرنے میں کوئی مدد نہیں مل سکتی اور ہر حوالے سے کسی نہ کسی شارح کی شرح کے ہم محتاج ہیں یہ دعویٰ محل نظر ہے۔ قرآن حکیم عربی زبان میں نازل کیا گیا تا کہ ہم عقل وفکر سے کام لے سکیں۔ دیکھئے (43/2),(12/2) فلہٰذا عربی زبان اور قرآن فہمی ان کے مابین ایک منطقی تلازم ہے جس سے کسی قیمت پر صرفِ نظر نہیں کرنا چاہئے۔

(3) دیکھئے جناب ندیم صاحب لکھتے ہیں کہ ساجد کا معنی ہے خاکساری کرنے والا اور عابد کا معنی ہے حریص اور لالچی اور ارشاد ہوا ہے کہ لغت کی رو سے تو یہ مفہوم صحیح ہے۔ خدا معلوم کہ جناب ندیم صاحب کے پاس کونسا اردو لغات ہے کہ جس میں عابد کے معنی حریص ولالچی انسان لکھا ہے۔ اگر ایسا کوئی لغات ہے تو وہ اس کا حوالہ دے کر اور اس کے پبلشر کا اتہ پتہ بتا کر ہمارے لئے جود وکرم کا باب وا کرنے میں بخل وتساہل سے کام نہیں لیں گے۔ ایسا مطالبہ کرنا بالکل بجا اور درست ہے کیونکہ آپ نے محولہ بالا عبارت میں اعتراف کیا ہے کہ لغت کے لحاظ سے تو یہ صحیح مفہوم ہے۔ جب لغات کے حوالے سے یہ صحیح ہے تو پھر لغات ہی سے سند کا مطالبہ کرنا بھی یقیناً صحیح اور معقول ہی ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ کسی لفظ کے عرفی وحقیقی یا مجازی معانی لینے کے بھی کچھ اصول اور ضابطے ہیں۔ یہ نہیں کہ کسی کا جو دل چاہے اور جب اور جیسا چاہے وہ مجاز کا بہانہ بنا کر اصل مفہوم ومدلول الفاظ کا تیا پانچا کر دے۔ لغات سے سند طلب کرنے کے علاوہ ہمارا دوسرا مطالبہ ان سے یہ ہے کہ وہ جناب پرویزؒ کے مضامین ومقالات اور معارف ومطالب کے ہزاروں صفحات پر پھیلے ہوئے ان جواہر پاروں میں سے کہ جنہیں اردو میں ادبِ عالیہ کا مقام حاصل ہو چکا ہے' کوئی ایک لفظ ایسا دکھا دیں کہ جس کے ساتھ جناب پرویزؒ نے وہی کچھ کیا ہو جو انہوں نے عابد کے لفظ کے ساتھ کیا ہے۔

آپ نے لکھا ہے کہ کسی جملے یا عبارت کا مفہوم متعین کرتے ہوئے ضروری ہے کہ الفاظ کا حقیقی ومجازی

استعمال پیش نظر ہو۔ آپ نے بالکل بجا کہا کہ الفاظ کے حقیقی و مجازی استعمالات پر نظر رہنی چاہئے۔ کیونکہ اگر اسے نظرانداز کر دیا جائے تو اس سے معانی میں بگاڑ پیدا ہوتا ہے اور ہمارے اردو زبان کے قدیم اور جدید مترجمین قرآن نے عام طور پر اس اصول کا التزام نہیں کیا جس سے ترجمہ قرآن کے دوران بہت سی معنوی پیچیدگیاں پیدا ہوگئی ہیں۔ لیکن بحمد اللہ پرویزؒ صاحب کا دامن اس سے پاک ہے۔ ہمارا علیٰ وجہ البصیرت دعویٰ ہے کہ انہوں نے الفاظ کے حقیقی و مجازی معانی کا ہمیشہ خیال رکھا ہے۔ ان کے درس کو سننے والے حضرات کے ذہنوں میں اس کی بے شمار مثالیں موجود ہیں لیکن ان سے استشہاد کرنا صحیح نہ ہوگا۔ لہٰذا مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ان کے مطبوعہ جواہر پاروں سے چند ایک عبارات کا حوالہ یہاں دے دیا جائے تاکہ یہ چیز آپ کے لئے ثبوت و شہادت کا کام دے اور ہمارے لئے زیادتیٔ ایمان و معرفت کا باعث ٹھہرے۔

1- جناب پرویزؒ مفہوم القرآن میں انتیسویں پارے کے آغاز میں ایک ضروری وضاحت کے عنوان کے تحت ارشاد فرماتے ہیں:

> ''مفہوم القرآن میں ان الفاظ کے مجازی معانی لئے گئے ہیں اور انہی کی روشنی میں متعلقہ آیات کے مطالب بیان کئے گئے ہیں۔ اگر کوئی صاحب ان الفاظ کے لغوی معانی لینا چاہیں تو وہ قرآن مجید کا کوئی سا مروجہ ترجمہ سامنے رکھ لیں یا میری لغات القرآن دیکھ لیں جس میں الفاظِ قرآن کے لغوی و مجازی دونوں معانی دیئے ہیں۔'' (مفہوم القرآن' جلد نمبر 3' صفحہ نمبر 1336)۔

اس حوالے سے یہ بات روز روشن کی طرح عیاں ہوگئی کہ جناب پرویزؒ نے الفاظ کے لغوی و مجازی معانی اور استعمالات کا التزام کیا ہے۔ لہٰذا ان پر یہ پھبتی کسی طرح فٹ نہیں کی جاسکتی کہ انہوں نے گویا اس اصولِ زبان کا انکار کر کے معانیٔ قرآن کو مسخ کرنے کی کوشش کی ہے۔

اب آیئے لغات القرآن کی جانب کہ جس میں آپ نے قدم قدم پر اس امر کا خیال رکھا ہے کہ کوئی لفظ کہاں لغوی و حقیقی معنی میں استعمال ہوا ہے اور کہاں مجازی معنی کے لئے۔ چند ایک حوالہ جات پیش خدمت ہیں:

i- مادۂ حیات کے ضمن میں آپ فرماتے ہیں'' بلکہ ان الفاظ کے معانی بہت وسیع ہیں۔ اسی طرح عربی زبان (اور قرآن کریم) میں بھی یہ الفاظ بہت وسیع المعانی ہیں۔ اس لئے ہر مقام پر نفس مضمون کے اعتبار سے یہ دیکھنا چاہئے کہ وہاں کون سے معانی زیادہ موزوں ہیں۔ (لغات القرآن' ص 572)۔

ii- اسی طرح 'ع ص و' کے مادے کے ضمن میں ارشاد فرماتے ہیں: ''عصائے موسیٰ کا ذکر قرآن کریم میں اور بھی متعدد مقامات پر آیا ہے مثلاً (20/18)۔ اگر اسے حقیقی معنوں پر محمول کیا جائے تو اس سے مراد لاٹھی ہوگی۔ لیکن اگر اسے مجازی معنی میں لیا جائے تو اس سے مفہوم وہ ضابطۂ خداوندی ہوگا (وحی کا پیغام) جو آپ کی زندگی کا سہارا اور قوم کے لئے وجۂ تقویت تھا اور جس کے سامنے ساحرینِ فرعون کی باطل تعلیم کوئی حقیقت نہیں رکھتی تھی۔ اس اعتبار سے قرآن کریم کے مختلف مقامات میں سیاق و سباق کے مطابق معانی متعین کئے جاسکتے ہیں۔ (لغات القرآن' ص 1169-1170)۔

مستند حوالہ جات کے بعد اس اعتراض میں کیا وزن رہ جاتا ہے کہ جناب پرویزؒ نے الفاظ کے حقیقی و مجازی معانی میں فرق و امتیاز کو روا نہیں رکھا جس کے نتیجے میں ان کے ہاں الفاظ و معانی کے مابین پایا جانے والا حقیقی رشتہ چور چور ہو گیا ہے۔

اب آیئے حقیقت و مجاز کے حوالے سے ہم آپ کے سامنے ایک مثال رکھ دیں اور اس امر کو بھی ظاہر کر دیں کہ کسی لفظ کے لغوی معنی سے مجازی معنی کی طرف کب رجوع کیا جاتا ہے۔ یاد رہے کہ وہ سبب کہ جو لغوی معنی سے مجازی معنی کی طرف منتقل ہونے کا باعث بنتا ہے اسے قرینہ صارفہ کہتے ہیں۔ آیئے ایک مثال پہ غور کرتے ہیں۔ عرب کہتا ہے ''رایت الاسد یرمی السہم''۔ جس کا مطلب ہے کہ میں نے شیر دیکھا اس حال میں کہ تیر پھینک رہا تھا۔ اس عبارت میں الاسد یعنی شیر کا لفظ استعمال ہوا ہے۔ اسد یعنی شیر کا لغوی معنی وہ جنگلی درندہ ہے جو حیوانوں کو پھاڑتا ہے۔ یہاں پر اسد سے مراد وہ جنگلی شیر نہیں کیونکہ اس کا حال یہ بیان کیا گیا ہے کہ وہ تیر پھینک رہا تھا۔ پس تیر پھینکنا یا کسی چیز کو نشانے پر لگانا انسان کا کام ہے نہ کہ حیوان لایعقل کا۔ پس تیر چلانا وہ قرینہ صارفہ ہے جو لغوی معنی کی بجائے مجازی معنی لینے پر ہمیں مجبور کرتا ہے اس لئے یہاں پر شیر سے مراد دراصل رجل شجاع یعنی بہادر آدمی ہے۔

(27/18) میں واردہ لفظ نملہ کے بارے میں اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں کہ اس نے خطاب کیا اور خطاب کرنے کے دوران یہ بیان بھی کیا کہ یہ آنے والا شخص سلیمان ہے اور اس کے ساتھ اس کا لشکر جرار بھی ہے۔ تم اس کے سامنے سے ہٹ جاؤ اور اپنی اپنی رہائش گاہوں میں جم کر بیٹھ جاؤ۔ ایسا نہ ہو کہ تمہارا اس کے لشکروں سے تصادم ہو جائے جس کے نتیجے میں وہ تمہیں کچل ڈالیں۔ اب یہ کلام اتنا بڑا قرینہ صارفہ ہے کہ جو کسی صاحب شعور انسان کو اسے ایک حیوان لایعقل یعنی چیونٹی ماننے کے لئے کسی صورت پر آمادہ نہیں کر سکتا۔ لیکن یہ صاحبان مصر ہیں کہ ہم اسے چیونٹی ہی مانیں۔ حالانکہ یہ معروف حقیقت ہے کہ ہر ایسی قوم اور ملت میں جو ابھی اقدار روحی سے ہم آہنگ نہ ہوئی ہو اس میں انسانوں کے نام حیوانوں پر رکھے جاتے ہیں حتیٰ کہ یہ رواج آج بھی دول یورپ میں عام ہے۔ آج بھی آپ کو وہاں مسٹر بل (بھینسا) جارج فاکس (لومڑ) مسٹر وولف (بھیڑیا) کے نام سنائی دیتے ہیں اور عربوں کے ہاں نزول قرآن کے وقت بھی بنو کلاب (کتے کے بچے) بنو اسد (شیر کے بچے) جیسے ناموں والے بڑے بڑے قبائل موجود تھے۔ اب ان اسماء کو سن کر کوئی شخص جنگلی کتوں یا بھیڑیوں کی جانب اپنے ذہن کو نہیں لے جاتا۔ لیکن قرآن حکیم میں چونکہ جناب ندیم صاحب نے اس نملہ کو صاحبِ اختیار و ارادہ انسان ماننے کی بجائے اسے حیوان لایعقل یعنی چیونٹی ثابت کرنے کے لئے ایڑی چوٹی کا زور لگایا ہے اور اپنی جانب سے اپنی دانست میں بڑے قوی دلائل دیئے ہیں اور اپنی عربی دانی کا اچھا خاصا اظہار کیا ہے' لہٰذا آئندہ چل کر ہم اس پر مفصل بحث کریں گے۔ نملہ کا لفظ سنتے ہی ہمارے ان صاحبان کا ذہن اسے وہ چیونٹی ماننے اور منوانے کے لئے گھومنے لگتا ہے' جو حیوان لایعقل ہے۔ لیکن یہ ہر حوالے سے غلط ہے کیونکہ نملہ کا کلام خود متعین طور پر بتا رہا ہے کہ اس کا متکلم کون ہے۔

سورۃ تکویر اور سورۃ النمل کے بارے میں جو کچھ ندیم صاحب نے تحریر کیا ہے اور اس کے حوالے سے جناب

پرویزؒ کا جس طرح تعاقب کرنے کی کوشش کی ہے۔ اس کا جواب دینے سے پہلے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے فہم قرآن کے باب میں خلاصۃ القول کے طور پر جو کچھ کہا ہے' ذرا اس کے بارے میں بھی گفتگو کرتے چلیں۔ ارشاد ہوتا ہے۔ ''آج کے دور میں قرآن مجید کی تفسیر کرتے ہوئے ضروری ہے کہ ان سب باتوں کا خیال رکھا جائے۔ ایک مفسر کے لئے ناگزیر ہے کہ وہ عرب معاشرے کی روایات' تاریخ عرب' عربی زبان اور اس کے مختلف اسالیب۔ جاہلی ادب اور رسولؐ اللہ کی سیرت کا گہرا مطالعہ اور ذوق رکھتا ہو' بھی محل نظر ہے اور اسی طرح قرآن مجید کی یہ حقیقت کہ وہ ایک کتاب ہے اور اس کا یہ لفظ سیاق وسباق کے ایک نظم سے بندھا ہوا ہے اس کے پیش نظر ہو''۔

اس عبارت میں صاحب تحریر نے جو جو نکات بحث کے لئے اٹھائے ہیں' ان پر فرداً فرداً گفتگو کرنا خاصا مشکل اور ایک طول طویل عمل ہے۔ البتہ ایک دو بنیادی نکات پر گفتگو کرنا اگلی بحث کے لئے راستہ ہموار کرنے کے لئے کافی معاون و مددگار ثابت ہوگا۔

1- سب سے پہلے صاحب تحریر نے مفسر قرآن کے لئے کچھ لوازمات کا تعین کیا ہے اور آخر میں جناب پرویزؒ کو اس جرم کا مرتکب قرار دیا ہے کہ انہوں نے ان امور کو اپنے پیش نظر نہیں رکھا۔ اب جہاں تک اس امر کا سوال ہے کہ مفسر قرآن کے لئے کن کن امور کا خیال رکھنا ضروری ہے اور کون کون سے امور اس حوالے سے اس کے لئے وجوب کی حیثیت رکھتے ہیں اور کن امور کی حیثیت امور استحبابیہ کی ہے تو ان امور لازمہ و غیر لازمہ کے درپے ہونے سے پہلے ایک دوسرے اہم سوال کا جواب دینا لازم ہے۔ وہ سوال یہ ہے کہ آیا کوئی بھی انسان خواہ اس کا مقام و مرتبہ اولین و آخرین میں سب سے بڑھ کر کیوں نہ ہو' کیا اسے مفسر قرآن ہونے کا مقام یا منصب دیا جا سکتا ہے؟ کیونکہ یہ بات تو ہمارے ایمانیات میں جزو لازم کے طور پر داخل ہے کہ قرآن کلام اللہ ہے یا قران ایک ایسی تصنیف ہے جس کا مصنف اللہ تعالیٰ خود ہے۔ اب یہ بات بھی بدیہی طور پر مسلم ہے کہ کوئی مفسر یا شارح مصنف کے علم وفضل کے مقام و مرتبہ سے فروتر نہیں ہوسکتا۔ اس کے لئے کم از کم اس کا ہم پلہ ہونا لازم ہے۔ ایسا ناممکن ہے کہ کسی کتاب کا مصنف تو اپنے فن یا اختصاص میں ایم۔اے یا پی ایچ ڈی کی ڈگریوں کا حامل ہو لیکن اسکی تفسیر وتشریح کرنے والا بی۔اے فیل ہو یا وہ صرف بی اے یا ایم اے کی کسی ثانوی یا کسی ادنیٰ ترین ڈگری یا شہادت کا حامل ہو۔ پس کسی بھی انسان کو کتاب اللہ کا مفسر بنانا یا ماننا اگر ایک طرف اللہ تعالیٰ کے مقام و مرتبہ کو گرانے کے مترادف ہے تو دوسری طرف ایسا کہنا یا کرنا کسی انسان کو اس کے بشری مقام و مرتبہ سے اٹھا کر اسے الوہیت کے مقام ومنصب پر فائز کرنے کے مترادف ہے۔ پھر دیکھئے اس کا لازمی نتیجہ یہ نکلے گا کہ ہم قرآن مجید کو اللہ تعالیٰ کا کلام ماننے کی بجائے انجام کار اسے کسی انسان کا کلام ماننے پر مجبور ہوں گے۔ نیز سوچئے! اگر اللہ تعالیٰ نے اپنے علاوہ کسی اور کو اپنے کلام کی تفسیر وتشریح کرنے کا حق دے رکھا ہے تو ایسا کیوں نہ ہوا کہ پورا کا پورا قرآن اسے یکبارگی دے دیا جاتا اور پھر چونکہ اسے اللہ تعالیٰ نے اپنے کلام کا اپنی جانب سے مفسر بنا رکھا تھا' لہٰذا بعد میں وہ یکسوئی کے ساتھ اسکی تفسیر و تشریح کرتا رہتا۔ حقیقت یہ ہے کہ اس موقف کے حامل افراد نے نہ تو اللہ تعالیٰ کی جلالتِ شان کا صحیح اندازہ لگایا ہے اور نہ

ہی انہوں نے اللہ تعالیٰ کے ابدی و سرمدی کلام یعنی قرآن پاک ہی کو اسکا قرار واقعی مقام دیا ہے۔ حتیٰ کہ انہوں نے انبیاء کرام کو بھی ان کے مقام و مرتبہ سے اٹھا کر الوہیت کے مقام و مرتبہ پر فائز کر دیا ہے۔ پس یہ حقیقت آفتابِ عالمتاب سے بھی بڑھ کر روشن و تابناک ہے کہ قرآن پاک بوجہ کلام اللہ ہونے کے کسی انسانی تفسیر و تشریح کا قطعاً محتاج نہیں ہے۔ لیکن اس حقیقت پر صرف وہی ایمان لائیں گے جو کہ الوہیت و بشریت کے امتیازی اوصاف و لوازم کی از روئے کتاب اللہ معرفت حاصل کر چکے ہیں۔ باقی رہے متفسرین کلام اللہ اور وہ ناقضین عہد کہ جنہوں نے اپنے ایمان و عقیدہ کو شرک سے آلودہ کر لیا ہے اور اس شرک کی آلودگی کی وجہ سے ظلم اور اس کے خصائص و لوازم کا ان پر قبضہ ہو گیا ہے، تو ان کے لئے اس حقیقت پر ایمان لانا خاصا مشکل معاملہ ہے۔

اب جہاں تک اس سوال کا تعلق ہے کہ کتاب اللہ کی تفسیر و تشریح کے حوالے سے ہم نے جس عقلی ضابطے کا اوپر ذکر کیا ہے، تو کیا اس کی تصدیق و تائید کتاب اللہ سے بھی ہوتی ہے یا یہ مجرد ہمارا ہی مسلمہ یا مفروضہ ہے۔ تو اس حوالہ سے عرض ہے کہ یہ مسلمہ ہمارے نزدیک اسی لئے مسلمہ ہے کہ کتاب اللہ کی آیات بینات سے اس کی تصدیق و تصویب ہوتی ہے۔ کیونکہ ہر وہ اصول یا ضابطہ کہ جس کی تصدیق و تائید کتاب اللہ سے نہ ہوتی ہو ہم اسے اصول یا ضابطہ تسلیم ہی نہیں کرتے اور جس کی تصدیق و تائید کتاب اللہ سے ہو جائے خواہ وہ لوگوں کے نزدیک مفروضہ ہی کیوں نہ ہو تو ہم اسے ثابت شدہ مسلمات اور واجب الاذعان عقائد کے طور پر اپنے قلوب و اذہان میں جگہ دے لیتے ہیں۔

اب آیئے یہ دیکھیں کہ کتاب اللہ کی آیات بینات اس حوالے سے ہماری کیا راہنمائی کرتی ہیں۔ ارشاد الٰہی ہے۔

وقال الذين كفروا لولا نزل عليه القران جملة واحده كذٰلك لنثبت به فوادك ورتلنه ترتيلا o ولا ياتونك بمثل الا جئنٰك بالحق و احسن تفسيرا۔ (25/32-33)۔

اور اہلِ کفر کا کہنا ہے کہ یہ قرآن اس پر یکبارگی کیوں نازل نہیں کر دیا گیا۔ یہ اس طرح اس لئے ہوا کہ ہم آپ کے دل و دماغ کو اس کے ذریعہ ثبات و استحکام عطا کریں اور ہم اس کی جمع و ترتیب اس طرح کر دیں کہ جس طرح اس کی جمع و ترتیب کرنے کا حق ہے۔ (اور اس طرح اس لئے بھی ہوا) کہ وہ آپ کے پاس جو اعتراض لائیں۔ ہم ضرور اس کا حقانی جواب آپ کے پاس لے آئیں (اور اس طرح اس لئے بھی ہوا) کہ ہم اس کی احسن تفسیر بھی کر دیں۔

اس مقام پر اللہ تعالیٰ نے اپنے کلامِ محکم نظام میں جن جن حقائق و معارف کی جانب اشارات کئے ہیں۔ ان کی طرف توجہ دلانے کے حوالے سے ہماری جو ابتدائی ذمہ داری ہے ہم اس سے عہدہ برآ ہو چکے ہیں۔ ہم طلبائے قرآن کا فریضہ ہے کہ ہم اس مقام پر خود تدبر کریں۔ اب اس مقام سے یہ بات تو روزِ روشن کی طرح عیاں ہو گئی کہ قرآنِ مجید میں نہ صرف اللہ تعالیٰ کے آخری کامل و مکمل کلام کا متن ہی محفوظ

ہے' بلکہ اس کے اندر الٰہی بیان کی رو سے اسکی احسن تفسیر (سب تفسیروں سے بڑھ کر حسن و جمال والی تفسیر) بھی موجود ہے۔ لہٰذا جب قرآنِ حکیم میں اس کا متن اور اس کی احسن تفسیر دونوں ہی محفوظ اور موجود فی الفرقان ہیں تو اب زمانہ جاہلیت کی جاہلی روایات کی خاک چھاننے کا جسے شوق ہو ان کی خاک چھانتا پھرے۔ مومنین قرآن تو اس طرح کی خاک چھاننے اور خارہ شگافی کرنے کی مشقتوں سے اللہ تعالیٰ کے فضل وکرم سے بالکل بچا لئے گئے ہیں (وللہ الحمد علی ذلک)۔

مزید برآں یہ کہ اس امر پر اس حوالے سے غور کیجئے کہ یہاں پر صاحب تحریر نے جن اصولوں کو قرآن فہمی کے لازمی اصولوں کے طور پر منوانے کی کوشش کی ہے اور ان کا التزام نہ کرنے کا جناب پرویزؒ کو مجرم گردانا ہے۔ انہوں نے عربیٔ مبین کے ماسوا جن جاہلی روایات و آثار اور دواوین وامثال کو شرطِ لازم کے طور پر بیان کیا ہے' ان کے حوالے سے سوال یہ ہے' کہ ان کے شرط لازم ہونے کی ان کے پاس قرآنی دلیل کیا ہے۔ نیز اگر یہ چیزیں فہم کتاب اللہ کے لئے شرط لازم اور تفسیر قرآن کے لئے ناگزیر لوازم کے طور پر ہیں تو ان کے' محمدؐ رسول اللہ سے لے کر متأخرین تک سند متواتر کے طور پر منقول ومتوارث ہونے کی ان کے پاس کیا سند یا شہادت ہے۔ حتمی ویقینی کلام کو ظنی روایات کا پابند بنانا کیا ناقابل معافی گناہ یا جرم نہیں ہے؟

اب آیئے اس امر کی جانب کہ جناب پرویزؒ نے چونکہ ان اصولوں کا التزام نہیں کیا لہٰذا ان سے فہمِ قرآن میں بے پناہ چوک ہی نہیں ہوئی بلکہ وہ اپنے وقت کی سب سے بڑی گمراہی میں مبتلا ہو گئے ہیں۔ اپنے اس بلند بانگ دعویٰ کو ثابت کرنے کے لئے صاحب تحریر نے جو قرآنی مثالیں اپنے اس مقالہ میں پیش کی ہیں وہ دو ہیں۔ ایک تو انہوں نے سیدنا سلیمانؑ کے حوالہ سے سورۃ النمل کا واقعہ نقل کیا ہے اور اس میں بالخصوص جنات اور وادی النمل کا جو حوالہ دیا ہے اسے بنیاد بنا کر انہوں نے جناب پرویزؒ کی ذات اور ان کے فہم قرآن کو مورد الزام ٹھہرایا ہے۔ صاحب موصوف کا دعویٰ ہے کہ اس مقام پر الجن سے مراد وہ غیر مرئی مخلوق ہے جو ناری ہے اور جو الانس سے' بقول ان کے' لازماً الگ نوعیت کی مخلوق ہے۔ وہ ناری الخلقت غیر مرئی مخلوق چونکہ جناب سیدنا سلیمانؑ کے لشکروں میں شامل تھی اور جناب پرویزؒ نے اسے پہاڑی دیوہیکل وحشی قبائل قرار دے دیا ہے' لہٰذا پرویزؒ صاحب نے ایسا کر کے' بقول ان کے اپنے آپ کو بہت بڑی ضلالت میں مبتلا کر لیا ہے۔ پھر اس کے بعد انہوں نے وادی النمل اور اس کی ایک نملہ کے کلام کو اپنے اعتراضات کے لئے نشانہ کے طور پر پیش نظر رکھا ہے۔ وادی النمل کے حوالے سے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ یہ واقعی حیوانی چیونٹیوں کی وادی تھی اور نملہ سے مراد لازماً ایک چیونٹی ہے اور اس کے کلام کو بقول ان کے کسی قیمت پر بھی حیوان لا یعقل کے علاوہ کسی صاحب عقل و بصیرت اور صاحب نطق وکلام انسان کا کلام قرار نہیں دیا جا سکتا۔ اس کے بعد آگے چل کر انہوں نے سورۃ تکویر کے حوالے سے ان مفاہیم کو موردالزام ٹھہرانے کی کوشش کی ہے جنہیں جناب پرویزؒ نے سورۃ تکویر کے ضمن میں بیان کیا ہے۔ چونکہ یہ مباحث اپنی ذات میں الگ الگ نہایت مہتمم بالشان مباحث ہیں اور گذشتہ بحث ویسے ہی کافی طولانی ہو چکی ہے' اس لئے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ان پر تفصیلی گفتگو کو

ہم اگلی مجلس کے لئے اٹھا رکھیں۔ لیکن ایسا نہ ہو کہ ہمارا مخاطب یہ محسوس کرنے لگے کہ ہمارے پاس چونکہ ان کے اٹھائے ہوئے نکات کا کوئی جواب نہ تھا اس لئے اس مقام پر بحث کو بند کرنے کے لئے بحث کے طولانی ہونے کا خواہ مخواہ بہانہ بنالیا گیا ہے اس لئے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ان مباحث پر آگے چل کر گفتگو کرنے سے قبل کچھ باتیں تمہیدی اصولوں کے طور پر یہاں بیان کردی جائیں۔ جو آگے چل کر اسی بحث کے لئے محور و مدار کا بھی کام دیں گی اور ساتھ ہی ساتھ ان کی موجودگی میں کوئی دوست یہ بھی نہ کہہ سکے گا کہ ہم نے بحث سے راہ فرار اختیار کر لی ہے۔ لہٰذا اس حوالے سے چند ایک گذارشات اپنے سامعین کے گوش گذار کرنا ہمارے لئے انتہائی طور پر مفید رہے گا۔

سوال یہ کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے کلام محکم نظام میں انبیاء سابقین کے ان احوال و کوائف کو کس مقصد کے لئے بیان کیا ہے۔ یعنی ان کے مذکور فی القرآن ہونے کی کوئی علت و غایت ہے یا نہیں؟ اگر کوئی علت و غایت ہے تو وہ نبی اکرم ﷺ کے حوالے سے کیا ہے اور اہل ایمان کے حوالے سے کیا؟ یہ بات کہنا کہ ان احوال و کوائف کو بیان کرنے کی کوئی علت یا غایت کوئی فلسفہ یا حکمت نہیں ہے' یہ امر' اللہ تعالیٰ کی جلالت شان اور تقدس ذات کے بالکل منافی ہے۔ کوئی شخص جس میں ادنیٰ ترین ایمانی بصیرت پائی جاتی ہو' وہ اس موقف کو قبول کرنے کے لئے کسی قیمت پر بھی تیار نہیں ہو گا۔ لہٰذا سوال یہ ہے کہ اس الٰہی حکمت کو ہم جاننے کی کیوں نہ کوشش کریں جو ان احوال و کوائف کے بیان میں پس منظر کے طور پر موجود و مذکور فی القرآن ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اس اساسی حکمت قرآنیہ کو نظر انداز کر دینے یا اس کے قلوب و اذہان سے اوجھل ہونے کی وجہ سے کتاب اللہ کا ایک بہت بڑا گرانقدر حصہ ہمارے لئے اسرائیلی روایات کے زیر اثر بھوت پریوں کے قصے کے مماثل قرار پا چکا ہے۔ اس حقانی و الٰہی حکمت و حقیقت سے ہمارے ہاں اغماض ہی نہیں برتا گیا بلکہ اس کی سمتِ مخالف میں ہمارے قلوب و اذہان کو بڑی بے دردی کے ساتھ ہانکا گیا ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ آج ہمارے ہاں مذہبی لٹریچر میں انبیاءؑ و رسلؑ کے حوالے سے قصص النبین کے نام پر مرتب ہونے والے مؤلفات میں ایسا مواد در آیا ہے کہ جس سے سلمان رشدی' تسلیمہ نسرین اور رنگیلا رسول کے مصنف راجپال جیسے فتنہ و فساد پرور اشخاص استفادہ کر کے عالم اسلامی کے فکری و نظریاتی امن و امان کے بھس میں فتنہ و فساد کی چنگاریاں پھینک کر اسے بھک سے اڑاتے رہتے ہیں اور آج بھی اڑا رہے ہیں۔ لیکن اگر الٰہی حکمت و غایت کو جسے اللہ تعالیٰ اپنے کلام محکم نظام میں روز روشن کی طرح بیان فرما چکے ہیں' ہم نے اصول محکم کے طور پر اپنے سامنے رکھا ہوتا تو ایک طرف تو ہم اپنے انفرادی و اجتماعی دائروں میں پائے جانے والے تضادات و ظلمات سے رستگاری حاصل کرنے کے لئے سابق انبیاءؑ کے احوال و کوائف سے حتمی و یقینی حکمت عملی حاصل کر چکے ہوتے اور دوسری طرف ان انوار و تجلیات کی موجودگی میں اسرائیلی روایات و خرافات کی ظلمت ہمارے نہاں خانۂ دل و دماغ تک تو کجا اس کے ظاہر تک بھی رسائی حاصل نہ کر سکتی۔ پس آیئے یہ دیکھیں کہ سابق انبیاءؑ کے احوال و کوائف کے بیان کے پیچھے وہ کونسی الٰہی حکمت و غایت ہے کہ جس کا تتبع کرنا ہمارے لئے بھی لازم ہے اور جس سے انحراف کرنا ہمارے زوال و ادبار کے لئے مرکزی حیثیت کا حامل ہے۔ اسی

حوالے سے قرآن حکیم کی سورۃ ھود میں اللہ رب العزت کا ارشاد اس طرح ہے۔

وکلا نقص علیک من انباء الرسل ماننثبت به فوادك و جاء ك فی هذه الحق و موعظة و ذکری للمومنین۔(11/120)۔

''اور یہ سب کچھ جو آپ کے سامنے سابق انبیاؑء کے حالات وکوائف میں سے بیان کیا جا رہا ہے' تو اس لئے کہ آپ کے دل و دماغ کو اس کے ذریعہ ثبات و استحکام عطا کریں اور اس (سورت ھود یا ان تمام احوال وکوائف) میں بھی الحق آپ کے پاس پہنچ گیا ہے۔ اس سب کچھ میں اہل ایمان کے لئے بھی خالص یاد دہانی اور ان کے شرف و مجد کی ضمانت پائی جاتی ہے''۔

کتاب اللہ کے اس واضح اور دوٹوک اعلان سے یہ بات روزِ روشن کی طرح عیاں ہو رہی ہے کہ سابق انبیاؑء کے احوال وکوائف کے بیان کی غایت نبی اکرم ﷺ کے دل و دماغ کو ثبات و استحکام عطا کرنا ہے اور ان واقعات کے بیان میں اہلِ ایمان کے لئے بھی خالص یاددہانی اور ان کے شرف و مجد کے حصول و یافت کی ضمانت پائی جاتی ہے۔ ہمارا ایمان ہے کہ وہ تمام کمالات و خصائص جو سابق انبیاؑء و مرسلینؑ میں الگ الگ پائے جاتے تھے وہ تمام کمالات بلکہ کچھ مزید اضافے کے ساتھ خاتم النبین محمد رسول اللہ ﷺ کی ذاتِ اقدس میں یکجا طور پر پائے جاتے ہیں۔ اسی طرح وہ تمام خوبیاں اور کمالات جو صحفِ سابقہ میں الگ الگ پائے جاتے تھے' وہ تمام خوبیاں اور کمالات خاتم الصحف قرآنِ پاک میں بدرجۂ اتم یکجا طور پر پائے جاتے ہیں۔ اسی طرح وہ کمالات و برکات جو سابقہ امتوں میں الگ الگ پائے جاتے تھے وہ بھی بدرجۂ اتم اس خاتم الامم' امتِ مسلمہ' امت محمدیہ ﷺ میں پائے جاتے ہیں۔

پس ہمارا سوال یہ ہے کہ اگر سیدنا سلیمانؑ کے لئے غیر مرئی' عالم الغیب' ناری الخلقت' ہر آن متغیر' مافوق العادت قوتوں اور طاقتوں کے مالک جنات کو مسخر کر دیا گیا تھا اور ایسے جنات چند ایک نہیں بلکہ ان کے لشکر تھے جو کہ سیدنا سلیمانؑ کے ماتحت کر دیئے گئے اور وہ ان مسخر شدہ جنات سے اپنے کارہائے منصبی کی ادائیگی میں مدد و تعاون حاصل کیا کرتے تھے تو ایسے بیانات سے نبی اکرمؐ کے دل و دماغ کو کیسے ثبات و استحکام عطا ہوگا جبکہ ایسا کوئی کمال اور ایسی کوئی موہبتِ خاص ان کو عطا نہیں کی گئی تھی۔ حقیقت تو یہ ہے کہ اس صورت میں ایسے بیانات (نعوذ باللہ من ذلک) آپ کے لئے اندوہ و دلگیری کا باعث بنیں گے۔ ایک مثال پر غور کیجئے۔ آپ اپنے ملازم سے کہتے ہیں۔ ہمارا ایک ایسا اور ایسا ملازم ہوا کرتا تھا۔ اس نے ایسی ایسی اور اتنی بڑی بڑی خدمات انجام دی تھیں۔ ہم نے اس کی ان خدمات سے خوش ہو کر اپنی خشکی و تری کی تمام چیزوں کو اس کے ماتحت کر دیا تھا۔ ہم نے اسے اپنے ہاں کے ماحول پر خاص الخاص تصرف دے رکھا تھا۔ کیا کہنا اس ملازم کا وہ تو نہایت وفا شعار ملازم تھا۔ اب بتایئے ایسے بیانات سے موجودہ ملازم کی حوصلہ شکنی ہوگی یا حوصلہ افزائی۔ حوصلہ افزائی تو اس صورت میں ہوگی کہ اسے بتایا جائے کہ ملازم تو ہمارے پہلے بھی تھے پر وہ تجھ جیسے کہاں تھے۔ ہم نے اپنے ہر ملازم کو نوازا مگر تیرے لئے ہماری نوازشوں کی نظیر کہاں۔ تجھے تو ہم

وہ کچھ دے چکے ہیں اور مزید دینے والے ہیں کہ وہ کچھ ہم نے آج تک کسی ملازم کو نہیں دیا اور نہ ہی آئندہ کسی کو اتنا دینے والے ہیں۔ بلاشبہ اس دوسرے بیان میں اس ملازم کی شان اختصاص ہی کا بیان نہیں ہے بلکہ اسے عطا ہونے والے انعامات بھی بلاشبہ بے مثال ٹھہرتے ہیں۔ پس اسی طرح ہمارے نزدیک وہ تمام کمالات' عنایات اور نوازشات جو سابق انبیاؑء پر فرداً فرداً ہوئی تھیں' وہ خاتم النبین محمد رسول اللہ ﷺ پر یکجا طور پر ہوئی ہیں اور اگر ایسا نہیں ہے تو ایسے بیانات میں آپ کے لئے اندوہ و دلگیری کے سوا کچھ نہیں ہے۔

پس خلاصہ کلام یہ کہ ہمارے یہ کرم فرما ذرا فکر و تدبر سے کام لیں۔ کیونکہ تدبر قرآن کسی 'تفسیر تدبر' کو پڑھ لینے سے حاصل نہیں ہوتا بلکہ اس کے لئے تو ہر فرد کو ایمان و ایقان سے آراستہ ہوکر براہ راست آیات الٰہی کے متن اور اس کے الفاظ کے منشاء وتصور کو پانے کے لئے مصروف تگ و تاز ہونا پڑتا ہے۔ پس سوچنے کی یہ بات ہے کہ ان غیر مرئی ناری الخلقت جنات کے سیدنا سلیمانؑ کے لئے مسخر کر دیئے جانے کے بیان میں خاتم النبین محمد رسول اللہ ﷺ اور آپؐ کے متبع اہل ایمان کے لئے' ان کی حوصلہ افزائی اور ان کے قلوب و اذہان کے ثبات و استحکام کا کونسا ساز و سامان پایا جاتا ہے۔ پھر یہ کہنا' جیسا کہ ہمارے اس مقالہ نگار نے اپنے اس مقالہ میں بیان کیا ہے کہ سیدنا سلیمانؑ کو ایسی عظیم الشان سلطنت دی گئی تھی جس کی نظیر تاریخ انسانی میں کہیں دکھائی نہیں دیتی (ص 51)۔ حقیقت یہی ہے کہ زمانہ جاہلیت کے جاہلی شعراء کے قصوں اور کہانیوں کو دن رات وردِ زبان اور حرزِ جان بنائے رکھنے سے یہی قلبی کیفیت پیدا ہوسکتی ہے۔ اس بندۂ خدا کو اتنا بھی معلوم نہیں کہ خلافتِ راشدہ کے دور کی سلطنت اور خلافتِ عربیہ کی حدود اور عظمت و جلال' سلیمانیؑ سلطنت سے کہیں بڑھ کر تھی۔ کیونکہ یہ سلطنت دراصل سلطنت محمدیہؐ تھی۔ وہ محمد ﷺ کہ جس کی آمد کے لئے داؤدؑ وسلیمانؑ اور موسیٰؑ و مسیحؑ چشم براہ تھے۔ پس اصل بات یہ ہے کہ زمانۂ جاہلیت کے شعراء کے کلام میں تو غل و اشتعال' قلوب کو ایمانی و عرفانی حوالے سے جس طرح زنگ آلود بناتا ہے' اسے دن رات اوڑھنا بچھونا بنائے رکھنے سے دل و دماغ میں جو حجابات پیدا ہوتے ہیں' یہ مضمون اسکی بہترین مثال ہے۔ ہمارا ایمان ہے کہ سلیمانیؑ کمالات سب کے سب بمعہ شی زائد کے' ہمارے محبوب ومتبوع خاتم النبین محمد رسول اللہ ﷺ کو ہی عطا نہیں کئے گئے تھے بلکہ آپ کی اتباع کرنے والے خدام قرآن کو بھی ہر ہر دور میں ان کے عطا کئے جانے کا مژدہ وخوشخبری سنائی گئی ہے۔ اے کاش کہ ان دوستوں نے ذرا تدبر سے کام لیا ہوتا تو ان کے لئے ان جنات کی حقیقت کو جان لینا کچھ مشکل نہ تھا۔

سوچئے! قرآنِ حکیم' سیدنا سلیمانؑ کے لئے جنات کے لشکروں کا ذکر کرتا ہے تو وہ غیر مرئی اور محیر العقول اور فوق العادت قوتوں اور طاقتوں کے حامل جنات جو ہمارے ان دوستوں کے قلوب واذہان پر مستولی ہیں غور کیجئے! ان کا مصداق یہ سلیمانیؑ جنات کیسے ہوسکتے ہیں۔ کیونکہ ایسا تو ایک جن ہی ان کے لئے ہر حوالے سے کافی تھا۔ ایسے تو ایک ہی جن سے پوری دنیا کو فتح اور مسخر کیا جاسکتا تھا اور جب اس کے لئے ایک ہی جن کافی ہے تو ایسے جنات کے لشکروں کی کہاں سمائی ہوگی۔ پھر غور کیجئے قرآن ڈنکے کی چوٹ پر اس امر کا اعلان جنات کی زبان سے کراتا ہے کہ وہ عالم الغیب

نہ تھے دیکھئے۔(34/14)۔

یہی باغات اور ان کے پھل پھول اور فواکہ و ثمرات ان کے لئے نعماء ہیں۔(55/11-13)۔

بادبانی کشتیاں اور بحری جہاز ان کے لئے نعماء ہیں۔(55/24)۔

رسول اور اس کی کتاب پر وہ ایمان لائے ہیں۔ (24/29)۔

محمد رسول اللہ ﷺ اور قرآن پر ایمان لانے سے پہلے وہ کتابِ موسیٰؑ پر ایمان رکھتے تھے۔ (46/29-30)۔

لیکن اس سب کچھ کے باوجود وہ تھے ناری الخلقت؟ یاللعجب! بہرحال مقالہ کافی طویل ہوگیا ہے۔اس لئے اگلی اقساط میں ہم سیدنا سلیمانؑ اور ان کے جنات۔ وادی النمل اور ان کی نملۃ اور سورۃ تکویر اور اس کے مشمولات کے حوالے سے محترم مقالہ نگار کے اٹھائے ہوئے نکات کا جواب دیں گے اور ثابت کریں گے کہ محترم مقالہ نگار جس روایتی واسرائیلی تفسیری مکتب فکر کے مؤید وترجمان ہیں اس کے مقابلے میں جناب علامہ پرویزؒ کا قرآن فہمی کا نقطۂ نظر علم وحکمت، نور وبصیرت اور ایمان ویقین کے حوالے سے نہ صرف بدرجہا بہتر اور مضبوط ہے بلکہ نوعِ انسانی کے مسائل کا بالعموم اور امت مسلمہ کی موجودہ حاضر مشکلات کا حل بالخصوص صرف اور صرف ان کے قرآن حکیم کی روشنی سے اخذ کردہ افکار وتصورات کو اپنانے پر ہی منحصر ہے اور بس۔

جنات سلیمانؑ اور قرآن حکیم: قارئین کرام کو یاد ہو گا کہ اس سے قبل ہم نے جو طویل اقتباس پیش کیا تھا کہ جس میں ہمارے فاضل مقالہ نگار نے علامہ پرویزؒ صاحب کی اصل غلطی کی نشاندہی کرنے کی کوشش کی تھی۔اس میں اس نے علامہ صاحب کے قرآن فہمی کے اصولوں کو ان کی اصل گمراہی کا سبب قرار دیتے ہوئے، اس کے نتیجہ میں ان کے انکار حدیث، انکار معجزات وانکار جنات کا خاص طور پر ذکر کیا تھا۔ دیکھئے ماہنامہ اشراق شمارہ ستمبر 90ء صفحہ نمبر 90 لہٰذا مناسب معلوم ہوتا ہے کہ علامہ پرویزؒ صاحب کے قرآن فہمی کے اصولوں پر گفتگو کرنے سے قبل ذرا ان مذکورۃ الصدر عنوانات پر گفتگو ہو جائے۔اگرچہ مقالہ نگار نے جس ترتیب سے ''منکرات پرویزؒ'' کا ذکر کیا ہے۔اس ترتیب کی رو سے تو ہمیں آغاز انکار حدیث سے کرنا چاہئے تھا۔لیکن انکار و اقرار حدیث کا موضوع چونکہ ایک مستقل بالذات موضوع ہے اور اس حوالے سے جناب پرویزؒ صاحب کو جس حد تک بدنام کیا جا رہا ہے اس کی نہ تو کوئی ابتداء ہے اور نہ ہی کوئی انتہا۔ اس ضمن میں پرویزؒ صاحب کو مورد الزام ٹھہرانے والوں کے پاس کوئی اخلاقی اصول یا مستقل معیار ہے ہی نہیں۔ان کے فکر ونظر کے تضاد کا یہ عالم ہے کہ یہ لوگ علامہ محمد اقبالؒ کو تو اپنا امام وراہنما مانتے ہیں۔انہیں اپنے فکری منابع اور ایمانی ماں باپ میں شمار کرتے ہوئے فخر محسوس کرتے ہیں۔لیکن جب علامہ اقبالؒ کے موقف حدیث کا حوالہ دیا جاتا ہے تو اسے بڑی تعلی اور پائے استحقار سے رد کر کے اپنے اس جادۂ تقلید پر کاربند رہتے ہوئے اندھوں اور بہروں کی طرح ظن وتخمین کی وادیوں میں سرگرداں رہنے پر اصرار کرنے لگتے ہیں۔لہٰذا اس موضوع کے حوالے سے ہم چاہتے ہیں کہ اس پر ذرا مفصل گفتگو ہو تا کہ اس طرح انکار حدیث کے اس غبارے سے وہ تمام ہوا نکال دی جائے

کہ جس کی وجہ سے یہ بڑا پھولا ہوا دکھائی دیتا ہے۔ بلکہ اس حوالے سے ان اسباب وعوامل اور رجال واشخاص کا بھی فکری ونظریاتی حوالے سے سخت محاسبہ کرنا چاہئے کہ جو اپنی مقبولیتِ عوام کی مسندوں کو تا ابد قائم و دائم رکھنے کے لئے اپنے نتھنوں کو پھلا پھلا کر اس غبارے میں ہوا بھرنے میں مصروف ہیں۔ اس حوالے سے ہم کتاب اللہ کی آیات محکمات سے استمداد و استدلال ہی نہیں کریں گے بلکہ امام شافعی کے رسالہ کتاب الام سے لے کر شاہؒ ولی اللہ کی الفوز الکبیر اور حجت اللہ البالغہ تک کے حوالہ جات بھی پیش کریں گے۔ پھر دور حاضر میں علامہ شبلی۔ علامہ حمید الدین فراہی۔ علامہ عبیداللہ سندھی اور آخر میں حکیم الامت علامہ محمد اقبالؒ کے خطبات مدراس سے اقتباسات پیش کر کے ثابت کریں گے کہ علامہ پرویزؒ صاحب کا موقف دربارہ حدیث وروایت وہی ہے جو بقول علامہ محمد اقبالؒ۔ امام ابوحنیفہؒ کا ہے کہ جن کی جانب فقہ حنفی اور اہل احناف منسوب ہیں۔ لہٰذا اگر انصاف پسندی کوئی اصول ہے تو ہم ان ناقدان پرویزؒ سے التماس کریں گے کہ یا تو وہ علامہ محمد اقبالؒ کو بھی منکرین حدیث میں شمار کریں' کیونکہ ان کے موقف حدیث اور علامہ پرویزؒ کے موقف حدیث میں سرِ مو فرق نہیں ہے اور اگر وہ ایسا نہ کریں تو کم از کم انہیں اپنے تضاد فکر ونظر پر کچھ تو ندامت محسوس کرنی چاہئے۔

اسی چیز کے پیش نظر ہم انکار حدیث اور انکار معجزات سے اپنی گفتگو کا آغاز کرنے کی بجائے جنات سلیمانؑ اور قرآن حکیم کے عنوان سے آج کی گفتگو کا آغاز کر رہے ہیں۔ جنات سلیمانؑ کے عنوان پر گفتگو کرنے سے قبل مناسب معلوم ہوتا ہے کہ جنات کے بارے میں قرآن حکیم نے اصولی حوالے سے جو ہماری راہنمائی کی ہے۔ اس پر تھوڑی سی گفتگو ہو جائے۔

جنات اور قرآنِ حکیم: بلاشبہ الجان کے بارے میں قرآن حکیم کا اعلان ہے کہ انہیں نارالسموم (زہریلی آگ) سے پیدا کیا گیا تھا (15/27) لیکن ان کی یہ پیدائش انسان کی پیدائش سے پہلے ہوئی تھی (15/27) یقیناً اللہ تعالیٰ نے الجان کو نارالسموم سے انسانوں سے قبل پیدا کیا اور ہمارا اس حقیقت پر مومن بالقرآن ہونے کے ناطے سے مکمل طور پر ایمان ہے۔ لیکن ہمارا موضوع یا زیر بحث مسئلہ یہ نہیں بلکہ یہ ہے کہ وہ جنات جن کا سیدنا سلیمانؑ کے حوالے سے قرآن حکیم میں ذکر پایا جاتا ہے (34/12-13, 27/17) اور وہ جنات کہ جو نبی اکرم ﷺ پر ایمان لائے تھے (72/1-2, 46/29) کیا وہ یہی ناری الخلقت' نارالسموم سے پیدا ہونے والے جنات تھے؟

پرویزؒ صاحب کا موقف ہے کہ نہیں ایسا نہیں ہے بلکہ یہ جنات انسان ہی تھے۔ لیکن انہیں ان کے قوی الجثہ اور طویل القامت ہونے کی وجہ سے جنات کہا گیا ہے۔ یہ اس لئے جنات تھے کہ وہ کسی ایک جگہ پر مستقل طور پر آباد نہ تھے۔ یہ وہ صحرائی یا پہاڑی قبائل تھے کہ جو میدانی علاقوں میں مقیم انسانوں کے پاس کبھی آتے اور کبھی غائب ہو جاتے تھے۔ پس انہیں اس حوالے سے کہ وہ کبھی نظر آتے اور کبھی نظروں سے اوجھل ہو جاتے تھے جنات کہا جاتا تھا۔ کیونکہ عربی زبان کی رو سے اور خود محاورہ قرآن کے حوالے سے بھی مادہ جن' کا یہ وہ بنیادی مفہوم ہے کہ جس کا کوئی صاحب بصیرت انسان انکار نہیں کر سکتا۔ مثلاً 53/32 میں اللہ تعالیٰ نے انسانوں کو اجنۃ قرار دیا ہے۔ جو کہ جنین کی جمع ہے اور

جس کا معنی ہے پوشیدہ رہنے والا۔ چھپا ہوا۔ نظر نہ آنے والا۔ چونکہ ہر بچہ اپنی پیدائش سے قبل اپنی ماں کے پیٹ میں پوشیدہ رہتا ہے۔ لہٰذا اسے اللہ تعالیٰ نے اس مقام پر جنین یعنی پوشیدہ رہنے والا قرار دیا ہے۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ نے 58/16 میں ڈھال کو جنہ قرار دیا ہے' کہ وہ انسان کے سر کو چھپا لیتی ہے۔ اسی طرح الجنتہ اس زمین یا باغ کو کہا جاتا ہے کہ جسے سائے یا گھاس پھوس نے ڈھانپ رکھا ہوتا ہے۔ اسی طرح دیوانے انسان کے لئے عربی زبان اور خود قرآن پاک کے محاورہ میں مجنون کا لفظ استعمال ہوا ہے۔ پس اس سے یہ بات کھل کر سامنے آ گئی کہ 'جن' کا بنیادی و ابتدائی مفہوم پوشیدہ رہنا یا نظروں سے اوجھل ہونا ہے۔ اب اس کا اطلاق کس کس پر کیا جا سکتا ہے۔ یہ ایک الگ موضوع ہے۔ ہمارا تدبر فی القرآن ہماری راہنمائی کرتا ہے کہ انسانوں کی پیدائش سے قبل اس کائنات میں ایک آتشیں مزاج مخلوق موجود تھی۔ جو کہ اس وقت کے آتشیں ماحول کے ساتھ کلی طور پر موافقت رکھتی تھی۔ لیکن جب خارجی ماحول میں وہ حدت و حرارت نہ رہی بلکہ اسکی جگہ سکون و برودت نے لے لی تو وہ مخلوق ماحول کے ساتھ عدم موافقت کی وجہ سے یا تو بالکل ہی ختم ہوگئی یا کسی ایسے کرہ میں جا کر آباد ہوگئی کہ جہاں کا ماحول اس کے مزاج سے موافقت رکھتا تھا۔ لیکن اس آتشیں مزاج مخلوق کا انسان اور انسانی دنیا سے قطعاً کوئی تعلق نہیں ہے۔ پس قرآن حکیم میں جہاں کہیں بھی الجن والانس کے الفاظ آئے ہیں وہاں پر الجن سے مراد انسان ہی ہیں۔ جو قوی الحسبۃ اور طویل القامت ہوں۔ جنہوں نے ابھی تک صحیح طور پر تہذیب و تمدن انسانی کی دہلیز پر مکمل طور پر قدم نہ رکھا ہو۔ اسی حوالے سے وہ الجن جو سیدنا سلیمانؑ کے لشکروں میں شامل تھے اور جو محمد رسول اللہ ﷺ پر ایمان لائے تھے۔ یہ سب کے سب انسان ہی تھے۔ ان میں سے کوئی بھی آتشیں جن نہ تھا۔ آیئے اس ضمن میں ہم اپنے موقف کے حق میں قرآنی شہادات کو ہلکے پھلکے انداز میں بیان کر دیں۔ ہوسکتا ہے ہمارا ندیم بھی ان پر غور و تدبر کر کے ہمارے ساتھ ہمنوا بن جائے۔ یاد رہے کہ جنات کے موضوع پر جب ہم تدبر فی القرآن کے مرحلے میں داخل ہوتے ہیں۔ تو یہ موضوع ہمیں تین حوالوں سے قرآن حکیم میں نظر آتا ہے۔

1- جنات کا عمومی بیان کہ جس میں عام جنات کا تذکرہ ہے اور ان کے حوالے سے کچھ ایسی اصولی باتیں بیان کی گئی ہیں کہ جو اس موضوع کو سمجھنے کے لئے ہماری مکمل طور پر راہنمائی کرتی ہیں۔

2- جنات محمدؐ۔ عام جنات کے علاوہ قرآن حکیم ان جنات کا بھی ذکر کرتا ہے کہ جو قرآن حکیم کے درس میں شریک ہو کر آخر کار قرآن حکیم کے مبلغ و منادا اور منذر و مبشر بن کر اپنی قوم کے پاس گئے تھے اور انہوں نے اپنی قوم کو نہایت حکیمانہ انداز میں ایمان باللہ اور ایمان بالقرآن کی دعوت دی۔ 72/1-2, 46/29۔

3- جنات سلیمانؑ۔ اس کے ساتھ ساتھ قرآن حکیم جب سیدنا سلیمانؑ کی سلطنت کے شکوہ و دبدبہ اور اس کی مضبوطی و استحکام کو بیان کرتا ہے تو اس ضمن میں سلیمانی لشکروں میں جنات کا بھی ذکر کرتا ہے۔ اگرچہ ہمارے فاضل مقالہ نگار نے جناب پرویزؒ صاحب کے حوالے سے آخر الذکر جنات ہی کے انکار کو ان کے کھاتے میں ڈالا ہے اور اسی حوالے سے ان کے گمراہ ہو جانے کا وہ شکوہ سنج

ہوئے ہیں۔اس حوالے سے اگر چہ ہمیں سلیمانی جنات ہی پر گفتگو کرنی چاہئے تھی۔لیکن سلیمانی جنات کی صحیح نوعیت و فطرت کو سمجھنے اور جنات کے باب میں قرآن حکیم کے موقف کو صحیح طور پر سمجھنے میں اوپر ذکر کئے گئے پہلے اور دوسرے جنات کے ضمنی عنوانات بھی بہت زیادہ مدد و معاون ہو سکتے ہیں۔لہٰذا ان پر ضمنی طور پر گفتگو کرنا خالی از فائدہ نہ ہوگا۔

عام جنات : عام جنات کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے ایک ضابطے کی طرف ہماری راہنمائی کرتے ہوئے سورۃ الانعام کی آیات 129-130-131 میں ارشاد فرمایا ہے کہ

1- اللہ تعالیٰ۔الجن اور الانس کے معشر یعنی گروہوں یا سوسائٹیوں کو یکجا کر کے ان سے خطاب فرماتے ہوئے ان سے پوچھے گا کہ کیا تمہارے پاس ایسے رسول نہ آئے تھے کہ جو تمہیں میں سے تھے۔یعنی یہ کہ ان کی نوع اور جنس اور تمہاری نوع اور جنس ایک ہی تھی۔(الم یاتکم ..... رسل ..... منکم)6/129۔

2- وہ دونوں گروہ جواب دیں گے کہ ہاں ہم اپنے بارے میں اس امر کی شہادت دیتے ہیں کہ ہمارے پاس ہم ہی میں سے رسول آئے تھے (6/130) اب یہ بات صاف ہوگئی کہ جنات کی جانب بھی ان کی نوع یا جنس کے رسول آئے ہیں۔جو ان کے سامنے اللہ تعالیٰ کی آیات پڑھا کرتے تھے اور جو انہیں قیامت کے دن کی ملاقات سے آگاہی عطا فرمایا کرتے تھے (6/131)۔

3- ارشاد فرمایا گیا ہے کہ جنات انسانوں سے بے پناہ فوائد اور منافع حاصل کیا کرتے تھے 6/129 اب سوچئے اگر الجن اور الانس کی نوع یا جنس الگ الگ ہے۔تو ان سے انسان کیسے فوائد اور منافع حاصل کر سکتے ہیں؟

4- ارشاد فرمایا گیا ہے کہ جنات کے انسانی اولیاء یعنی جنات سے نصرت وحمایت حاصل کرنے والے افراد اس امر کا اعتراف کریں گے کہ وہ ایک دوسرے سے ساز و سامانِ حیات حاصل کیا کرتے تھے (6/129) اب سوچئے جب الجن اور الانس کی نوع اور جنس ہی الگ الگ ہے تو الجن کے انسانی اولیاء ان سے ساز و سامانِ حیات کیسے حاصل کر سکتے ہیں؟

پس ان نکات سے یہ بات کھل کر سامنے آ گئی کہ جنات کے رسول بھی ہیں۔جو انہی کی نوع وجنس کے ہیں اور ان کے اولیاء ان سے خوب استفادہ حاصل کرتے ہیں۔پس معلوم ہوا کہ الجن غیر مرئی اور ناری الخلقت اور انسانوں سے الگ تھلگ نوعیت کی مخلوق نہیں ہے۔

نیز ان امور پر اس نقطہ نظر سے بھی غور رمائیں کہ جس کا گذشتہ سطور میں حوالہ دیا جا چکا ہے کہ نمبر 1- سرسبز و شاداب باغات اور ان کے پھل پھول اور طرح طرح کے غلہ جات جنات کے لئے بھی نعماء الٰہی کی حیثیت رکھتے ہیں۔ 55/11-13۔

یاد رہے کہ ہمارے ان روایتی مذہبی پیشواؤں کے خیال کے بموجب جنات کی خوراک گوبر۔ہڈیاں اور کوئلے ہیں۔جبکہ قرآن حکیم اس کے برعکس ان کے لئے اوپر بیان کردہ چیزوں کا بطور نعمتِ الٰہی ذکر کرتا ہے۔

2- بادبانی کشتیوں اور بحری جہازوں کو اللہ تعالیٰ نے جنات کے لئے بھی اسی طرح اپنی نعمت قرار دیا ہے۔ 55/24-25 جس طرح انسانوں کے لئے انہیں نعمت قرار دیا ہے۔اب سوچئے کہ وہ جنات جن کا وجود ہوائی اور حد

درجہ لطیف ہے کہ وہ اپنی اس لطافت ہی کی وجہ سے بقول ان مذہبی پیشواؤں کے' ہماری نظر سے پوشیدہ ہیں اور جو ہر آن نئی سے نئی شکل وصورت اختیار کرنے پر قادر ہیں اور جو آن واحد میں سرینگر کشمیر سے سری لنکا پہنچ جاتے ہیں۔ غور کیجئے ان کے لئے بادبانی کشتیاں یا بحری جہاز تو کجا کیا تیز سے تیز رفتار ہوائی جہاز بھی بطور نعمت ٹھہرائے جاسکتے ہیں۔ لیکن اگر حکیمِ مطلق اللہ تعالیٰ نے انہیں ان کے لئے نعمت قرار دیا ہے تو بات بڑی واضح ہے کہ ان کے بارے میں یہ تمام دیو مالائی تصورات خرافات کے سوا کچھ نہیں ہیں۔

عام جنات کے حوالے سے ہم نے رسولوں کی آمد و بعثت اور ان کے اپنی اپنی قوم کے سامنے آیاتِ الٰہی کی تلاوت کرنے کا بھی گذشتہ سطور میں حوالہ دیا ہے۔ 6/131 اس سے پتہ چلتا ہے کہ رسول جنات میں سے بھی ہیں۔ لیکن پورے قرآن میں کسی ایک جنی رسول کا کوئی ادنیٰ ترین اشارہ بھی نہیں پایا جاتا۔ اس کے برعکس ہم دیکھتے ہیں کہ یہ جنات محمد رسول اللہ ﷺ پر ایمان لائے ہیں۔ ان کا تعلق قوم موسیٰ سے ہے اور وہ کتاب موسیٰ' تورات کی تلاوت کیا کرتے تھے اور کتاب موسیٰ تورات کا حوالہ دے کر انہوں نے اپنی قوم کو قرآن حکیم پر ایمان لانے کی دعوت دی تھی 46/29۔ لہٰذا بات بڑی صراحت سے سامنے آ گئی کہ یہ جنات بھی انسان ہی تھے' نہ کہ کوئی غیر مرئی مخلوق۔

جنات محمد ﷺ: اب آیئے ان جنات کے بارے میں تھوڑی دیر غور وخوض کریں۔ جن کا ذکر محمد رسول اللہ ﷺ کے حوالے سے قرآن حکیم میں بیان ہوا ہے۔ یہ بیان قرآن حکیم کے دو مقامات یعنی سورۃ الاحقاف اور سورۃ الجن میں پایا جاتا ہے۔ چونکہ سورۃ الجن ایک مستقل بالذات سورت ہے اور اس پر گفتگو کرنا ایک مستقل نشست کا طالب ہے۔ لہٰذا فی الحال ہم اپنی گفتگو کو صرف سورۃ الاحقاف کے حقائق و معارف تک محدود رکھیں گے۔ اس ارشاد الٰہی 46/29 سے یہ امور ثابت ہوتے ہیں۔

1- یہ جنات عربی زبان جانتے تھے کیونکہ جونہی قرآن حکیم کے الفاظ کی آواز ان کے کانوں تک پہنچی انہوں نے ایک دوسرے کو خاموشی کے ساتھ اسے سننے کا مشورہ دیا۔

2- جب وہ قرآنی مجلس میں حاضر ہوئے تو نہایت باادب طریقے سے وہ قرآنی حقائق ومعارف کو سنتے رہے۔ انہوں نے اس سماعت کے دوران کسی ردوکد یا شور وغل کا کوئی مظاہرہ نہ کیا۔ کیونکہ اگر ان کی طرف سے ایسی کسی حرکت کا ارتکاب ہوا ہوتا تو قرآن حکیم میں اس کی جانب کوئی نہ کوئی اشارہ ضرور پایا جاتا۔

3- وہ قرآنی مجلس سے جب نکلے تو وہ نہ صرف اس پر ایمان لا چکے تھے بلکہ ان میں یہ داعیہ بھی بیدار ہو چکا تھا کہ وہ قرآن حکیم کے حوالے سے عائد ہونے والے فریضۂ انذار کو بھی انجام دیں گے۔ لہٰذا انہوں نے واپس جا کر اپنی قوم میں نہایت بھرپور طریقے سے یہ فریضہ انجام دیا۔

4- انہوں نے اپنی قوم کے سامنے کتاب موسیٰ کا حوالہ دیا اور کتاب موسیٰ کے توسط سے انہوں نے اپنی قوم کو قرآن مجید اور رسول اکرمؐ پر ایمان لانے کی دعوت دی۔ ان نکات سے یہ بات اظہر من الشمس ہوگئی کہ وہ یہودی العقیدہ تھے جن کی مکی سوسائٹی یا اس مکی ماحول واطراف میں کبھی کبھار آمدورفت ہوتی رہتی تھی۔ اسی نسبت سے قرآن حکیم میں ان پر الجن کے لفظ کا اطلاق ہوا ہے۔

5- یہ الجن بنی اسرائیل تھے۔ کتاب موسیٰ پر ایمان رکھتے تھے اور یہ بات ظاہر ہے کہ سیدنا موسیٰؑ صرف بنی اسرائیل کے رسول تھے۔ آپ کی رسالت یا نبوت کا دائرہ صرف بنی اسرائیل تک محدود تھا۔ اس سے پتہ چلا کہ یہ جنات جو محمد رسول اللہ ﷺ پر ایمان لائے کوئی غیر مرئی۔ ناری الخلقت مخلوق نہ تھے۔ بلکہ یہ آلِ یعقوب کے افراد تھے اور بس اور چونکہ 72/1-2 میں انہی کے اقوال کا حوالہ دیا گیا ہے۔ لہٰذا سورۃ الجن میں مذکورہ جنات بھی اہل کتاب ہی ہیں۔ خواہ ان کا تعلق یہود سے ہو یا نصاریٰ سے۔

اب دیکھئے یہ الجن مکی دور میں مومن ہوئے اور مکی دور میں رسول اکرم ﷺ اور آپ کے اصحابؓ پر جو مصائب ڈھائے گئے' ان کے بیان سے قرآن حکیم بھرا پڑا ہے۔ اب سوچئے۔ ان جنات کے مومن ہو جانے کے بعد ان پر دوسرے اہل ایمان کے حوالے سے جو نصرت و امداد از روئے قرآن واجب ہو چکی تھی 8/72 اس سے عہدہ برا ہونے کے لئے انہوں نے کوئی ادنیٰ ترین مدد کی؟ پھر سوچئے۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول ﷺ اور صحابہ کرامؓ کے حوالے سے ملائکہ کی نصرت کا اپنے کلام میں ذکر کیا ہے 8/9-12 , 3/51 تو اگر یہ الجنات بھی کسی نصرت و امداد کے حوالے سے آئے ہوتے تو قرآن حکیم میں لازماً اس کا ذکر کیا جاتا۔ پھر سوچئے۔ جب نبی اکرم ﷺ اپنے رفیق خاص کے ساتھ مکہ سے ہجرت کر کے مدینہ کی طرف روانہ ہوئے 9/40 اس دوران آپ کو جن کٹھن مراحل سے گزر کر اور جن پریشان کن حالات کو عبور کر کے آپ کے لئے مدینہ میں پہنچنا ممکن ہوا اور اس میں جس قدر وقت لگا اور انصار مدینہ کو دن رات جو ایک لمبی مدت تک زحمت انتظار سے دوچار ہونا پڑا۔ وہ ہم سب کو معلوم ہے تو اگر ایک بھی ایسا جن مومن ہوا ہوتا تو وہ آپ کو اپنی پشت پر سوار کر کے آن واحد میں مکہ سے مدینہ پہنچا دیتا۔ اس طرح نہ آپ کو راستے کی مشکلات سے دوچار ہونا پڑتا۔ اور نہ ہی انصار مدینہ کو زحمت انتظار میں مبتلا رہنا پڑتا۔ اسی طرح غزوۂ احد و حنین کے دوران اگر کوئی ایسا مومن جن مددگار بن کر کھڑا ہو جاتا۔ تو اس طرح اہل ایمان جن پسپائیوں میں مبتلا ہوئے اور جن کٹھنائیوں سے انہیں دوچار ہونا پڑا۔ اس صورت میں یقیناً اس ناخوشگوار صورت احوال سے اہل ایمان بالکل دوچار نہ ہوتے۔

بردران عزیز! قرآنی بیانات سے یہ بات آپ کے علم میں آ چکی ہے کہ جنات نبی اکرمؐ پر ایمان لائے 46/29 , 72/1-2 اور وہ قرآن حکیم کے مبلغ بنے اور انہوں نے قرآن حکیم کے حوالے سے فریضۂ انذار نہایت ہمت و جوانمردی سے انجام دیا۔ 46/30-31 اس سے بھی یہ بات روز روشن کی طرح واضح ہو جاتی ہے کہ یہ جنات انسان اور بشر ہی تھے۔ یہ کوئی غیر مرئی ناری الخلقت نہ تھے۔ وجہ اس کی یہ ہے کہ نبی یا رسول کی بعثت کا ایک مقصد یہ ہوا کرتا ہے کہ وہ اپنے عمل اور اتباع وحی سے اس حقیقت کو مبرھن کیا کرتا ہے کہ وحی کا نفاذ اور اس کا معاشرتی حقیقت میں تبدیل کیا جانا اور اس کے مطابق فرد کی تربیت ذات کرنا اور اس کے مطابق معاشرتی انقلاب برپا کرنا بالکل ممکن ہے۔ گویا نبی اپنے اسوۂ حسنۃ سے کتاب اللہ کے نفاذ کے ممکن العمل ہونے کے پہلوؤں کو دو اور دو چار کی طرح ثابت کر دکھاتا ہے۔

اس کا ایک فائدہ یہ ہوتا ہے کہ دوسرے انسان

کلام اللہ کے مطابق اپنے آپ کو ڈھالنے اور وحی کی اقدار کے مطابق انقلاب برپا کرنے کے حوالے سے کوئی عذر یا حجت پیش نہیں کر سکتے۔ کیونکہ نبی نے بر بنائے بشر ہونے کے اگر کلام اللہ کو ایک زندہ معاشرتی حقیقت میں تبدیل کر دیا ہے تو دوسرے اہل ایمان انسان بھی ایسا کر سکتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے قدم قدم پر قرآن حکیم میں آپ کی بشریت ہی کو بیان نہیں کیا 41/6, 18/110 بلکہ دوسرے انبیاء کی بشریت کو بھی بڑے شد و مد سے بیان فرمایا ہے 14/10 , 64/5 , 17/95 اس سے ہم جس اصول یا الٰہی ضابطے کی جانب اپنے محترم قارئین کی توجہ مبذول کرانا چاہتے ہیں وہ یہ ہے کہ مرسل (جسے رسول بنایا جائے) اور مرسل الیہ (جس کی طرف رسول بنا کر بھیجا جائے) ان دونوں کی جنس یا نوع یا ان کے جنسی و نوعی تقاضے ایک ہوا کرتے ہیں۔ اس حوالے سے اللہ تعالیٰ سورۃ بنی اسرائیل میں یوں ارشاد فرماتے ہیں۔ اگر زمین پر فرشتے ہوتے اور وہ سکون و اطمینان کے ساتھ اس زمین پر چلا کرتے تو ہم ان کے لئے آسمان سے فرشتہ رسول ہی برپا کرتے 17/95 گویا فرشتوں کا رسول فرشتہ ہو گا۔ انسانوں کا رسول انسان بشر ہو گا۔ گویا کوئی رسول بشر کسی ایسی مخلوق کے لئے فریضہ رسالت انجام نہیں دے سکتا کہ جس کی نوع اور جنس اپنے مرسل الیہ گروہ کی جنس اور نوع سے الگ ہو۔ پس اگر کوئی غیر مرئی ناری الخلقت جنات ہوں گے تو ان کے لئے رسول بشر تو یقیناً رسول نہیں بنایا جا سکتا۔ اس کے لئے لازم ہو گا کہ اس طرح کے کسی غیر مرئی ناری الخلقت جن ہی کو ان کے لئے بطور رسول مبعوث کیا جائے۔ اب یہ بات تو کتاب اللہ کے الفاظ سے دو اور دو چار کی طرح ثابت ہو چکی ہے کہ جنات محمدؐ رسول اللہ پر ایمان لائے 46/29 اور یہ کہ محمد رسول اللہ ﷺ بشر تھے 18/110 وہ کسی حوالے سے جن نہ تھے۔ پس اس صغریٰ و کبریٰ کو ملانے سے اس کے سوا کوئی دوسرا نتیجہ نہیں نکلتا کہ یہ مومن بالقرآن اور مومن بامحمدؐ جنات انسان تھے اور بس۔

سلیمانی جنات: گذشتہ صفحات میں جن امور کی وضاحت کی جا چکی ہے۔ ان پر اگر ہماری نظر مرتکز رہے تو سلیمانی جنات کو سمجھ لینا اور ان کی جنس اور نوع کے بارے میں فیصلہ کر لینا کچھ مشکل نہیں رہتا۔ یہ تو ایک تسلیم شدہ حقیقت ہے کہ حضرت سلیمانؑ بھی اللہ تعالیٰ کے رسولوں اور نبیوں میں سے ایک رسول و نبی تھے اور اللہ تعالیٰ کے تمام انبیاء اور رسل کے لئے ایک ہی ضابطہ یا طریق کار تھا۔ پس اگر 17/95 کی رو سے مرسل اور مرسل الیہ کے مابین نوعی اتحاد کا پایا جانا لازم ہے تو سلیمانؑ اور ان کے جنات کے مابین جنسی مغائرت کو تسلیم کرنا قرآنی اصولوں کی نفی کرنے کے مترادف ہے۔ اب جہاں تک اس سوال کا تعلق ہے کہ سیدنا سلیمانؑ کے حوالے سے جن جنات کے ان کے لئے مسخر کئے جانے کا قرآن حکیم میں مذکور ہے 34/13-27/17 ان کی دراصل قرآن کی بیان کردہ نوع یا جنس کیا ہے۔ تو اس کا جواب از روئے کتاب اللہ یہی ہے کہ وہ سیدنا سلیمانؑ کی طرح انسان اور بشر ہی تھے۔ وہ کوئی غیر مرئی یا ناری الخلقت مخلوق نہ تھے۔ یہ دراصل پہاڑی اقوام اور وہاں کے دیو قامت معمار، مزدور غواص۔ نجار وغیرہ تھے۔ ان میں وہ لوگ بھی تھے کہ جو اپنے ملک سے اپنے حکمرانوں کی اجازت لے کر سلیمانی مملکت میں آتے تھے۔ اپنی اغراض پوری کر کے واپس چلے جاتے تھے اب ہم نے اس عبارت میں ان

سلیمانی جنات کے بارے میں جو جو دعوے کئے ہیں۔ ان کے بارے میں قرآنی ارشادات پر غور فرمائیں۔

1- ہم نے کہا ہے کہ یہ پہاڑی علاقوں کے لوگ تھے جو مختلف اغراض و مقاصد کی تکمیل کے لئے سیدنا سلیمانؑ کے ماتحت کام کیا کرتے تھے۔ یہ پہاڑی لوگ سیدنا سلیمانؑ کو اپنے جلیل القدر باپ سیدنا داؤد سے منتقل ہوئے تھے۔ کیونکہ سیدنا داؤد علیہ السلام کے حوالے سے قرآن مجید میں ارشاد فرمایا گیا ہے۔ کہ وسخرنا مع داؤد الجبال یسبحن والطیر 21/79 اور ہم نے پہاڑوں کو (پہاڑی لوگوں کو) جناب داؤد کی خدمت میں لگا دیا اور نیز تیز رفتار گھوڑوں کے دستوں کو بھی ان کی خدمت میں لگا دیا۔ یہ سب اپنے فرائض و واجبات کی ادائیگی کے لئے اپنے زوردروں کی بنیاد پر مصروف تگ وتاز رہا کرتے تھے۔ ہم نے یہاں پر الجبال کا ترجمہ اہل الجبال یعنی پہاڑی لوگ کیا ہے۔ جبکہ روائتی ترجمہ یوں ہے۔ کہ اللہ تعالیٰ نے پہاڑوں کو جناب سیدنا داؤد کے ماتحت کر دیا اور پہاڑوں کی تسبیح سے اہل روایات یہ مراد لیتے ہیں کہ جب سیدنا داؤد ترانہ حمد گاتے تو کوہ و دمن اس سے جھومنے لگتے تھے۔ اصل بات یہ ہے کہ ملوکیت کے غیر پیداورانہ نظام حکومت کے ماتحت بادشاہوں کے حضور میں خوشامدانہ مدحیہ قصیدہ خوانی کو بے پناہ اہمیت حاصل ہوگئی ہے اور دور ملوکیت کی یہ ذہنیت مذہبی اذہان میں بالخصوص اس حد تک راسخ ہو چکی ہے کہ جس کا ختم ہونا بظاہر خاصا مشکل دکھائی دیتا ہے۔ دیکھئے اللہ رب العزت کی ذات تو احکم الحاکمین ہے 95/8 کوئی ادنیٰ ترین حاکم خواہ وہ کسی تحصیل کا تحصیلدار یا نائب تحصیلدار ہی کیوں نہ ہو وہ اس امر سے ہرگز راضی نہیں ہوگا کہ صبح وشام اس کے حضور میں اس کو راضی کرنے کے لئے زبانی کلامی تعریف کے پل باندھے جائیں۔ لیکن اس نے اپنے زیر انتظام رہنے والی رعیت پر فرائض و واجبات کی تعمیل یا ادائیگی کا جو فریضہ عائد کیا ہے اس کی جانب سے غفلت برتی جائے یا اس فریضہ سے عہدہ برا ہونے کے دوران کوتاہی یا کسلمندی سے کام لیا جائے۔ پس سیدنا داؤد کے ساتھ اہل جبال کی تسبیح یہ تھی کہ وہ نظام الٰہی کے نفاذ اور ربوبیت عالمینی کے قیام کے حوالے سے اپنے اوپر عائد ہونے والے فرائض و واجبات کی ادائیگی کے لئے مصروف تگ وتاز رہا کرتے تھے۔ اب اس مقام پر سوال پیدا ہوگا کہ ہمارے پاس جبال سے اہل جبال مراد لینے کا ثبوت کیا ہے؟ نیز ہمارے پاس اس امر کی کیا شہادت ہے کہ ان کی تسبیح سے مراد فرائض و واجبات کی ادائیگی کے لئے ہر آن مصروف تگ وتاز رہنا ہے۔ جہاں تک اس سوال کا تعلق ہے کہ جبال سے مراد اہل الجبال ہیں تو ہمیں معلوم ہونا چاہئے کہ یہ قرآنی محاورہ ہے کہ وہ مضاف الیہ کے مضاف کو حذف کر دیا کرتا ہے اور مضاف الیہ پر ال کا وجود مضاف کے حذف پر دلیل وشہادت کا فریضہ انجام دیتا ہے۔ دیکھئے قرآن حکیم میں ارشاد ہوا ہے کہ۔ واسئل القریۃ التی کنا فیھا 12/82۔ یہ سیدنا یعقوب کے بیٹوں کی اپنے باپ کے حضور میں استدعا ہے کہ اگر آپ کو ہمارے اس بیان پر شک ہے تو آپ اس امر کی تصدیق کر لیں اور اس کے لئے آپ اس بستی سے جا کر پوچھ لیں۔ جہاں پر ہم اقامت پذیر رہے ہیں۔ اب سوچئے کیا اس دور میں بستیاں بولا کرتی تھیں یا آج بولا کرتی ہیں۔ یہاں تو کسی معجزہ کا بھی ذکر نہیں ہے کہ اسے معجزہ مان کر گلوخلاصی کرا لی جائے۔ بات صاف ہے کہ یہاں پر القریۃ (بستی) سے مراد

اہل القریہ بستی والے ہیں۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ سیدنا لوطؑ کے حوالے سے ارشاد فرماتا ہے کہ۔ ونجینہ من القریۃ التی کانت تعمل الخبٰئث 21/74۔

ہم نے اسے (مراد سیدنا لوطؑ) کو اس بستی سے نجات عطا کی کہ جو فحش کاری کا ارتکاب کیا کرتی تھی۔ پس یہاں بھی بات بڑی واضح ہے کہ فحش کاری زنا۔ قتل۔ ڈاکہ زنی اور لواطت جیسے اعمال شنیعہ کا ارتکاب بستی یا اس کے در و دیوار نہیں کیا کرتے تھے۔ بلکہ ان کے مرتکب بستیوں والے ہوا کرتے ہیں۔ پس ان مثالوں سے یہ امر روز روشن کی طرح ظاہر ہو گیا کہ جیسے یہاں القریۃ سے مراد اہل القریۃ ہیں اسی طرح سیدنا داؤد کے حوالے سے الجبال سے مراد اہل الجبال یعنی پہاڑی علاقوں کے عوام الناس اور وہاں کے عمائدین اور اہل حرفہ ہی ہیں اور بس۔ اب جہاں تک دوسرے سوال کا تعلق ہے کہ تسبیح سے مراد فرائض و واجبات کی ادائیگی ہے تو دراصل اللہ تعالیٰ کی ذات الصمد اور غنی عن العالمین ہے۔ لوگوں کی تعریفیں یا ان کا انکار و نافرمانی اس کی ذات میں کسی بھی کمی بیشی کا کسی قیمت پر بھی سبب نہیں بنتے۔ اس الصمد غنی عن العالمین اللہ' رب العالمین نے جو احکام و ہدایات بھیجے ہیں۔ وہ سب ہماری بھلائی اور ہماری فلاح کے حوالے سے ہیں۔ حتیٰ کہ اللہ تعالیٰ نے ہمیں جو اوامر و نواہی کا نظام دیا ہے۔ اس کی تعمیل یا عدم تعمیل بھی ہمارے ہی بناؤ یا بگاڑ کے حوالے سے ہے۔ پس اللہ تعالیٰ کی تسبیح و تحمید کا تمام تر مفاد بھی انسانی ذات کی فلاح کے حصول ہی سے وابستہ ہے اور بس۔ دیکھئے اللہ تعالیٰ سورت النور میں ارشاد فرماتے ہیں کہ۔ الم تر ان اللہ یسبح لہ من فی السمٰوٰت والارض والطیر صٰفٰت کل قد علم صلاتہ و تسبیحہ واللہ علیم بما یفعلون 24/41۔ کیا تو نے غور نہیں کیا (یعنی تجھے غور کرنا چاہئے تھا) کہ اللہ تعالیٰ کے لئے تسبیح کر رہے ہیں۔ وہ سب جو آسمانوں میں ہیں اور وہ جو زمین میں ہیں اور پرندے بھی صف در صف نوع بنوع اس کی تسبیح کر رہے ہیں۔ ان میں سے ہر ایک اپنی اپنی صلوٰۃ اور اپنی اپنی تسبیح کو بہت اچھی طرح جان چکا ہے اور اللہ تعالیٰ کو خوب معلوم ہے کہ یہ کیا کیا یا کیا کچھ افعال و اعمال انجام دے رہے ہیں۔ پس معلوم ہوا کہ ہر ہر چیز کا ان فرائض و واجبات کو انجام دینے کے لئے مصروف تگ و تاز رہنا ہی دراصل اس کا اپنی تسبیح کو انجام دینا ہے۔ پھر اسی تسبیح کے عمل کو چاند۔ سورج یا سماوی کروں کے حوالے سے بیان کیا گیا ہے (36/40, 21/33) پھر رسول اکرمؐ کے حوالے سے سورۃ المزمل میں ارشاد فرمایا گیا ہے کہ ان لک فی النھار سبحا طویلاً 73/7 دن کے اوقات میں تو تمہارے لئے بہت مصروفیات ہیں (ترجمہ مودودی صاحب)۔ غرضیکہ یہی لوگ سیدنا سلیمانؑ کو اپنے باپ سیدنا داؤدؑ کی جانب سے ملے اور وہ ان سے طرح طرح کے کام لیا کرتے تھے۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے۔ ومن الجن من یعمل بین یدیہ باذن ربہ ومن یزغ منھم عن امرنا نذقہ من عذاب السعیر o یعملون لہ ما یشاء من محاریب و تماثیل و جفان کا لجواب و قدور اسیات..... 34/12-13۔ اور جنات کو سلیمان کے ماتحت کیا گیا جو اس کے احکام کے پیش نظر اپنے

آقا کے اذن کے مطابق طرح طرح کے کام انجام دیا کرتے تھے اوران میں سے جوکوئی ہمارے قانون یا منشاء کی خلاف ورزی کیا کرتا تھا تو ہم اسے اس کی اس سرکشی کا مزا چکھایا کرتے تھے۔ وہ اس کے لئے اس کی منشاء کے عین مطابق فوجی چھاؤنیاں۔ جنگی اسلحہ۔ طرح طرح کے ماڈل ڈھانچے۔ ڈیزائن اور نقشے بنایا کرتے تھے۔ اسی طرح وہ حوضوں جیسے بڑے بڑے لگن یا ٹینکیاں بھی بنایا کرتے تھے اور وہ بڑی بڑی دیگیں تیار کیا کرتے تھے جو کہ زمین کے اندر گڑی رہا کرتی تھیں۔ پھر دوسرے مقام پر ان میں معماروں اور غوطہ خوروں کو بھی شمار کیا گیا ہے 38-37/38 یہاں پر 34/13 میں جو یہ ارشاد فرمایا گیا ہے کہ ہم سرکشی اختیار کرنے والوں کو اس کا مزہ چکھایا کرتے تھے۔ جس کا ترجمہ اہل روایات نے یوں کیا ہے کہ اس کو ہم بھڑکتی آگ کا مزہ چکھاتے (ترجمہ مودودی صاحب) تو یہ ترجمہ صحیح نہیں یہ ترجمہ صرف اس مفروضہ کی بنیاد پر کیا گیا ہے کہ یہ جنات چونکہ ناری الخلقت تھے لہٰذا انہیں سزا بھی دہکتی آگ ہی کی دی جاتی ہوگی۔ لیکن ہمارے نزدیک یہ ترجمہ غلط ہے۔ اس کے غلط ہونے کی ہمارے پاس دلیل یہ ہے کہ اس حقیقت کو اللہ تعالیٰ نے خود اپنے کلام میں دوسرے مقام پر یوں ارشاد فرمایا ہے۔ واخرین مقرنین فی الاصفاد 38/38 اور کچھ اور تھے کہ جنہیں بیڑیوں یا بیڑکوں میں محصور کر کے رکھا جاتا تھا۔ یعنی سرکش افراد کو دوسرے لوگوں سے الگ تھلگ رکھ کر ان سے کام لیا جاتا تھا۔ تاکہ وہ کام تو کریں لیکن ان کی بری صحبت کے اثرات متعدی ہو کر دوسروں کے لئے بگاڑ کا باعث نہ بنیں۔ غرضیکہ کتاب اللہ کے ان مقامات سے سلیمانی جنات کے بارے میں یہ بات کھل کر واضح ہوگئی کہ یہ جنات بھی عام جنات ہی کی طرح تھے اوران میں اور جنات محمدؐ میں 46/29 کوئی نوعی فرق و امتیاز نہیں پایا جاتا تھا۔

مقرنین فی الاصفاد کے روایتی ترجمہ پر بھی ذرا غور کریں اور دوسرے جو کہ پابند سلاسل تھے 38/38 (ترجمہ مودودی صاحب) سوال یہ ہے کہ وہ غیر مرئی ناری الخلقت مخلوق جسے جن یا شیطان کہا جاتا ہے۔ اسے پابند سلاسل کیسے رکھا جا سکتا ہے یا دیگر مترجمین کے نقطہ نظر سے انہیں بیڑیوں یا زنجیروں میں قید کر کے کیسے رکھا جا سکتا ہے۔ بات بڑی واضح ہے کہ وہ لطیف مخلوق جو بقول علماء روایات کے ہوا کی طرح لطیف جسم کی مالک ہو اور جو ہر آن نئی سے نئی شکل وصورت تبدیل کرنے پر قادر ہو۔ ایسی کسی مخلوق یا اسکے کسی فرد کو لوہے کی زنجیروں یا بیڑیوں میں کیسے مقید رکھا جا سکتا ہے۔ پس اس بات سے کہ نافرمان جنات کو الگ تھلگ کر کے مختلف محنت و مشقت کے کاموں پر لگایا جاتا تھا۔ یا بقول اہل روایات انہیں آہنی زنجیروں میں مقید رکھا جاتا تھا۔ اس امر کا واضح ثبوت ہے کہ یہ غیر مرئی ناری الخلقت مخلوق نہ تھے بلکہ یہ گوشت و پوست کے بشر و انسان تھے اور انہیں اسی طرح جیسے کہ آج بھی کوئی مہذب حکومت نافرمان لوگوں کو شرفاء سے الگ تھلگ کر کے قید خانوں میں ڈال کر رکھا کرتی ہے۔ رکھا جاتا تھا۔

سلیمان اوران کے جناتی لشکر: سلیمان کے ان ہنر مند کاریگروں۔ انجینئروں۔ معماروں، ڈیزائنروں اور مزدوروں کے علاوہ جو کہ سول شعبوں میں مختلف فرائض و واجبات انجام دیا کرتے تھے، ان کے علاوہ کچھ جنات سلیمانی لشکروں میں بھی طرح طرح کی فوجی خدمات انجام

دیا کرتے تھے۔ ان کا ذکر کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں کہ۔ وحشر لسلیمٰن جنودہ من الجن والانس والطیر فھم یوزعون 27/17۔ اور سلیمان کے لئے اس کے جناتی۔ انسانی اور طیر کے لشکروں کو ایک مہم کے لئے اکٹھا کر کے اس کو سر کرنے کے لئے انہیں کوچ پر کوچ کروایا جا رہا تھا۔ ان کی پلٹنوں کو منزل بمنزل الگ الگ پلٹنوں کی صورت میں آگے بڑھایا جا رہا تھا۔ اس سے ہمارے مخاطب ندیم صاحب اور ان کے قابل اعتماد روایتی علماء یہ تاثر دیتے اور تصور قائم کرتے ہیں کہ یہ غیر مرئی ناری الخلقت جنات تھے۔ لیکن ہمارے یہ بزرگ اس سادہ سی حقیقت پر غور نہیں کرتے کہ جنات کا جو تصور ان کے اذھان میں ہے اس کے پیش نظر تو سلیمان کو لشکروں کی کیا ضرورت تھی۔ کیونکہ یہ بات تو سب بزرگ تسلیم کرتے ہیں کہ ایسے جنات اولین و آخرین میں صرف سیدنا سلیمانؑ ہی کے لئے مسخر کئے گئے تھے۔ تو جب سیدنا سلیمانؑ کے وقت میں ان کے مدمقابل کے کسی بھی چھوٹے یا بڑے بادشاہ یا ملکہ کے پاس ایسے جنات افراد کے طور پر بھی نہ تھے اور سیدنا سلیمانؑ کے پاس ایسے جنات افراد کے طور پر نہیں بلکہ لشکر در لشکر کی صورت میں تھے۔ تو اس صورت میں سیدنا سلیمانؑ کو اپنے ہیڈ کوارٹر کو چھوڑ کر کسی مہم کو سر کرنے کے لئے باہر نکلنے کی کیا ضرورت تھی۔ وہ چند ایک جنات یا ان کی ایک معمولی سی ٹولی کے؟ ذریعہ ایسی کسی بڑی سے بڑی مہم کو بھی چند منٹوں میں سر کر سکتے تھے۔ بات بڑی واضح ہے کہ ایسے دیو مالائی جنات کا وجود ایک واہمہ ہے۔ ایسا کوئی جناتی وجود نہ سلیمانؑ کے دور میں تھا۔ اور نہ ہی آج ہے۔ پس یہ جنات آپ کی افواج میں اہل جبال کی وہ خصوصی بٹالین تھی۔ جس کا کام پہاڑوں کو اڑانا انہیں راستے سے ہٹا کر ان میں ہموار راستے بنانا۔ راستوں کو پختہ کرنا یا پل وغیرہ تعمیر کرنا تھا اور بس۔

وادی النمل اور نملۃ: سلیمانی جنات کے عنوان سے متعلق ہی دوسرا عنوان وادی النمل اور ان کی نملۃ کا کلام کرنا ہے۔ یہاں پر بھی جناب ندیم صاحب نے اہل روایات کے زیر اثر اور ان کی اندھی تقلید میں مبتلا ہو کر اس امر کو ثابت کرنے کے لئے ایڑی چوٹی کا زور لگایا ہے کہ وادی النمل کسی نمل نامی قوم کی وادی نہ تھی۔ بلکہ یہ واقعی کیڑوں مکوڑوں یا چیونٹیوں ہی کی وادی تھی اور اسی طرح نملہ کے جس کلام کا اللہ تعالیٰ نے حوالہ دیا ہے۔ اس سے مراد بھی چیونٹی اور اس کا کلام ہے۔ جہاں تک اس دلیل کا سوال ہے کہ کس چیز کی بنیاد پر انہوں نے اتنا بڑا دعویٰ کیا ہے۔ تو اس حوالے سے نہ تو ان کے پاس تصریف آیات کے حوالے سے قرآن حکیم کے کسی دوسرے مقام کی کوئی شہادت ہے اور نہ ہی ان کے پاس کلام عرب کے شواہد میں سے کوئی شاہد ہی ہے۔ اسی طرح اس دعویٰ کو ثابت کرنے کے لئے ان کے پاس ان کے محبوب جاہلی شعراء میں سے کسی کا کوئی کلام یا اس کا کوئی ادنیٰ ترین اشارہ بھی بطور دلیل موجود نہیں ہے۔ لے دے کے ان کے پاس بس یہ دلیل ہے کہ وادی النمل کی کسی عورت خواہ وہ ان کی ملکہ ہی کیوں نہ ہو۔ اسے قرآن حکیم کو نملیۃ کہنا چاہئے تھا۔ یعنی قوم نمل کی طرف منسوب عورت' اس قوم سے وابستہ عورت' حقیقت یہ ہے کہ اس استدلال کو پڑھ کر ان بیچاروں کی عقل اور عربی زبان کے بارے میں ان کے علم و فضیلت کے دعوؤں کا بھرم پوری طرح کھل گیا ہے۔ اسے پڑھ کر ان کے استاذ امام جناب حمید الدین فراہی کے

بارے میں جناب علامہ مودودی صاحب نے سورۃ الفیل کے حوالے سے جو گرفت کی ہے۔ وہ یاد آ جاتی ہے۔ علامہ مودودی صاحب نے سورۃ الفیل میں ایک عربی عبارت تحریر کی ہے اور کہا ہے کہ اگر اللہ تعالیٰ اس مفہوم کو ادا کرنا چاہتے کہ جو علامہ فراہی نے بیان کیا ہے تو اس کے لئے عربی عبارت یوں ہونا چاہئے تھی۔ یعنی جناب مودودی صاحب نے استاذ امام فراہی صاحب کو اس قدر کند ذہن اور غبی ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ جو اتنی بات کو نہ سمجھ سکے تھے۔ حالانکہ استاذ امام حمید الدین فراہی مرحوم کی عربی زبان کی مہارت بہرحال مودودی صاحب کی بہ نسبت کہیں بڑھ کر تھی اور اس کی بہترین شہادت ان کی وہ عربی مولفات ہیں جو چھپ کر اہل علم سے خواہ وہ عرب ہوں یا عجم داد تحسین وصول کر رہی ہیں۔ پس آیئے ان کی اس نملیۃ والی دلیل کو ذرا میزان علم وحکمت میں تولنے کی کوشش کریں۔ اگر چہ یہ اتنی بودی اور بے بنیاد بات ہے کہ اس کے لئے فلا نقیم لھم یوم القیمٰتہ وزنا 18/105۔ پس ہم ان کے لئے قیامت کے دن ترازو کھڑا نہیں کریں گے۔ پر اگر ہم عمل کرتے تو زیادہ بہتر ہوتا۔ لیکن اس صورت میں ان کے پندار نفس کا غبارہ اور پھول جاتا کہ دیکھا ہماری اتنی بڑی دلیل کا وہ کوئی جواب تو کیا دیتے۔ وہ تو اسکی جانب کوئی ادنیٰ ترین اشارہ تک نہیں کر سکے پس جہاں تک وادی النمل کا سوال ہے تو ہمارے نزدیک اس سے مراد وہ وادی ہے کہ جس میں قوم نملہ آباد تھی اور اس قوم پر کسی مرد کی حکمرانی ہونے کی بجائے ان کی ایک عورت حکمران تھی۔ معلوم ہوتا ہے کہ اس دور میں عورتوں کی حکمرانی کے نظریہ کا بول بالا تھا۔ کیونکہ ملک سبا پر بھی از روئے قرآن ایک ملکہ ہی حکمران تھی۔ باوجویکہ وہاں کے مردوں کا دعویٰ تھا کہ وہ بڑے زور آور اور جنگجو افراد ہیں 27/33۔ لیکن ہمارے نزدیک وادی النمل سے مراد چیونٹیوں کی وادی ہرگز نہیں اور نہ ہی یہ کسی چیونٹی کا کلام ہے۔ اسے کسی چیونٹی کا کلام قرار دینا علم وحکمت کے موتیوں کی مالا کو کوڑے کرکٹ کے مقام پر ڈالنے کے مترادف ہے۔ اب جہاں تک اس بات کا تعلق ہے کہ یہ حیوان لایعقل چیونٹی کا کلام نہیں ہے۔ بلکہ کسی دانا بینا ہوشمند انسان کا کلام ہے۔ اس کے لئے درج ذیل امور پر غور کیا جانا چاہئے۔

1- حیرانی ہوتی ہے ان لوگوں پر جو اپنے بارے میں زبان دانی کے بلند بانگ دعاوی کرتے رہتے ہیں۔ جو اسالیب کلام پر گفتگو کرنے کا اپنے آپ کو تنہا اجارہ دار سمجھتے ہیں کہ وہ اس جگہ اس کلام کو چیونٹی کی طرف منسوب کر رہے ہیں۔ حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ کلام تو خود بولا کرتا ہے۔ کلام اپنے متکلم کی خود گواہی دیتا ہے۔ کلام سے متکلم کی شرافت یا دنائت کا پتہ چلتا ہے۔ کلام اپنے متکلم کی جلالت یا رذالت پر خود گواہ ہوا کرتا ہے۔ ہر کلام کی اپنی ایک شان ہوا کرتی ہے۔ جو اپنے متکلم کی جانب مخاطب یا سامع کو کشاں کشاں لئے جایا کرتی ہے۔ اس باب میں سید مودودی مرحوم نے کیا خوب کہا ہے دیکھئے 12/52-53 کے بارے میں متقدمین سے اختلاف چلا آ رہا ہے۔ ایک گروہ کے نزدیک یہ زلیخا زن عزیز کے الفاظ ہیں تو دوسرا گروہ اسے سیدنا یوسف کا کلام مانتا ہے۔ ہم بھی اسی دوسرے گروہ کے ساتھ ہیں۔ بہرحال اس حوالے سے سید مودودی مرحوم نے کیا خوب لکھا ہے۔

''لیکن مجھے تعجب ہے کہ ابن تیمیہ جیسے دقیقہ رس

آدمی تک کی نگاہ سے یہ بات کیسے چوک گئی کہ شان کلام بجائے خود ایک بہت بڑا قرینہ ہے کہ جس کے ہوتے ہوئے، کسی اور قرینے کی ضرورت نہیں رہتی تفہیم القرآن جلد دوئم، ص 410''۔

یعنی کلام خود اپنے متکلم کی گواہی دے دیتا ہے۔ اسی طرح یہ 27/18-19 خود بولا رہا ہے کہ یہ کلام کسی حیوان چیونٹی کا ہے یا کوئی دانا بینا ہوشمند انسان اس کا متکلم ہے آیئے ہم آپ کے لئے ایک قرینہ نہیں بلکہ کئی ایک قرائن کی نشاندہی کر دیں۔

2- (الف) سب سے پہلی بات یہ ہے کہ کلام لفظی انسان کا خاصہ ہے کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے۔ خلق الانسان علمہ البیان 55/3-4۔ یعنی قوت بیانیہ انسان کا اختصاص ہے۔ کلام جہاں بھی ہوگا وہاں شعور اختیار وارادہ ہوگا۔ یہ حقیقت ہے۔ ہاں مجازی طور پر قول کا اطلاق زمین 41/11 آسمان 41/11 وغیرہ کی طرف بھی ہوا ہے لیکن یہ مجاز ہے اور کسی جگہ مجاز ماننے کے لئے قرائن کا ہونا ضروری ہوا کرتا ہے۔

(ب) اس عظیم الشان نملہ یعنی ملکہ نے کہا۔ یایھا النمل 27/18۔ اے نمل۔ یہاں پر غور کریں۔ یایھا النمل فرمایا جارہا ہے۔ اگر یہ بے عقل چیونٹی کا بے عقل چیونٹیوں کو خطاب ہوتا تو یایتھا النمل..... ہونا چاہئے تھا۔ ادخلو 27/18 دیکھئے اگر کوئی بے عقل بے عقلوں کو حکم دے رہا ہوتا تو اسے ادخلی کہنا چاہئے تھا۔ مسٰکنکم 27/18 غور کیجئے یہاں پر ایک تو مساکن کا لفظ جس کا معنی سکونت گاہیں اور رہائش گاہیں ہے اور جو قرآن حکیم میں جہاں بھی استعمال ہوا ہے انسانی آبادیوں اور ان کی رہائش گاہوں کے لئے استعمال ہوا ہے۔ کوئی ایک استثنائی مثال بھی نہیں پیش کی جا سکتی۔ پھر کم۔ جو کہ مضاف الیہ ہے۔ یہ بھی ان کے بے عقل ہونے کی نفی کرتا ہے۔ اگر یہاں پر بے عقل حیوان مراد ہوتے تو ضمیر ک استعمال ہونا چاہئے تھی۔ لا یحطمنکم سلیمٰن و جنودہ وھم لا یشعرون 27/18 نہ روند ڈالیں تمہیں سلیمان اور ان کے لشکر۔ غور کیجئے یہاں پر پھر ک کی بجائے کم کی ضمیر استعمال ہوئی ہے۔ دوسری بات یہ کہ یہاں پر حطم کا لفظ استعمال ہوا ہے۔ جس کا معنی ہوتا ہے۔ روندنا۔ پیس دینا۔ چورا چورا کر دینا۔ قرآن حکیم میں ارشاد ہوا ہے کہ۔ لو نشاء لجعلنٰہ حطاماً..... 56/65۔ اگر ہماری مشیت کا تقاضا ہوتا تو ہم اسے چورا چورا کر دیتے۔ نیز جہنم کے بارے میں ارشاد فرمایا گیا ہے کہ۔ ما ادرٰك ما الحطمة 104/5۔ آپ کس عمدہ طور پر جانتے ہیں کہ وہ پیس ڈالنے والی کیا ہے۔

غور کیجئے حیوان لایعقل اپنے بارے میں کس قدر زبردست خطرہ کا احساس کر رہا ہے۔ وہ کہہ رہا ہے کہ تمہیں سلیمانؑ اپنے لشکروں کے ساتھ تباہ و برباد کر ڈالے گا۔ سوچئے جہاں سے سیدنا سلیمانؑ اپنے لشکروں کے ساتھ چلے تھے وہاں سے لے کر اب تک کوئی چیونٹی آپ کے یا آپ کے لشکروں کے پاؤں میں مسلی نہیں گئی تھی؟ وھم لا یشعرون 27/18۔ وہ شعور نہیں رکھتے ہیں۔ غور کیجئے یہ کتنا بڑا قرینہ ہے کہ جو وہ ملکہ ظاہر کر رہی ہے۔ وہ اپنی قوم سے کہہ رہی ہے کہ تم اپنے گھروں میں پرامن طریقے سے بیٹھے رہو۔ لشکر جرار کے سامنے نہ آؤ۔ کیونکہ انہیں کچھ معلوم نہیں ہے کہ ہم سلیمان کے دوست ہیں یا دشمن یا ہمارا اس کے

دشمنوں سے کوئی تعلق ہے یا نہیں۔ ہمارا مجرد سامنے آنا یہ تاثر دے سکتا ہے کہ ہم بھی اپنے آپ کو کچھ سمجھتے ہیں۔ جس سے ہو سکتا ہے کہ کوئی مڈبھیڑ ہو جائے یا کوئی نادان ایسے ہی شرارت کر دے اور پھر دوسری طرف سے جوابی کارروائی ہو۔ تو اس طرح جنگی قوت کے ہاتھوں ہمیں روند دیا جائے۔ سوچئے۔ حیوان لا یعقل کو کیسے پتہ چلا کہ آنے والا سلیمان ہے اور یہ کہ یہ اس کے لشکر ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ یہاں لا یشعرون کا قرینہ اتنا بڑا ہے کہ اس کے ہوتے ہوئے کوئی بے شعور ہی اس کا انکار کر سکتا ہے۔ اگر معاملہ مجرد حیوان لا یعقل کا ہوتا تو وہ کہتی مبادا تمہیں وہ روند نہ ڈالے اس حال میں کہ تم انہیں نظر نہ آؤ۔ یعنی ان دیکھے وہ تمہیں روند ڈالیں۔ لیکن یہاں وھم لا یرون یا لا ینظرون یا لا یبصرون کی بجائے ھم لا یشعرون وہ کہہ رہی ہے جس کا معنی ہے کہ وہ اس امر کا شعور نہیں رکھتے۔ انہیں اس بات کا کوئی علم نہیں ہے کہ ہمارے اور اس کے دشمنوں کے مابین تعلقات کی نوعیت کیا ہے۔ چونکہ ہم بھی اس کے دشمنوں کے قرب و جوار میں رہتے ہیں۔ لہٰذا ہو سکتا ہے کہ وہ گمان کر لے کہ ہمارے اور اس کے دشمنوں کے مابین ہمسائیگی کے تعلقات دوستی اور پکی دوستی پر مشتمل ہیں۔ لہٰذا اور نہیں تو کم از کم ہم اس کے لشکروں کی تعداد ان کی ہیئت کذائی کی رپورٹ تو اس کے دشمنوں تک کسی نہ کسی طرح پہنچا سکتے ہیں۔ وغیرہ وغیرہ۔

آگے 27/19 میں فرمایا گیا ہے کہ۔ سیدنا سلیمانؑ نے ملکہ اور اس کے کلام اور اس کی اس حکمت عملی کو اپنے لئے اللہ تعالیٰ کی بہت بڑی نعمت قرار دیا اور دعا کی کہ اے رب العزت تو مجھے اس نعمت کے بھرپور اور اپنے قانون کے مطابق استعمال کی توفیق عطا فرماتا رہ۔ مجھے توفیق دیتا رہ کہ میں ایسی نعمتوں کو تیری خوشنودی کے حصول کے لئے استعمال کرتا رہوں۔ تو سوچئے۔ غور کیجئے۔ کیا بھلا حیوان لا یعقل چیونٹی کے اس کلام نے عظیم الشان رسول میں اتنا بڑا داعیہ دعا پیدا کر دیا تھا۔ نہیں نہیں۔ بلکہ حقیقت یہ تھی کہ آپ کے قرب و جوار میں پائی جانے والی اقوام آپ سے مقابلہ کرنے کی بجائے پرامن طریقے سے مذاکرات کر کے سلامتی کے راستے پر چلنے کا اظہار کر رہی تھیں اور چونکہ انبیاء کرام ملکوں کو فتح کرنے کے لئے نہیں آیا کرتے بلکہ ان کا مشن تو قلوب یعنی دل و دماغ کو فتح کر کے عبودیت و ربوبیت عالمین کا قیام ہوتا ہے۔ اسی لئے سیدنا سلیمانؑ اللہ تعالیٰ کا شکر بجا لا رہے ہیں کہ اے اللہ رب العزت تیرا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ تیرے نظام ربوبیت کے قیام سے اب ہم اس منزل تک جا پہنچے ہیں کہ ہمارے دشمن برسر پیکار ہونے کی بجائے خود بخود صلح و سلامتی کے لئے آمادگی پر آمادگی ظاہر کر رہے ہیں۔ یہی وہ بات ہے کہ جب رسول اکرمؐ نے مدینہ میں قرآنی نظام عبودیت و ربوبیت کو نافذ کر دیا۔ تو صلح حدیبیہ کے بعد نہایت ہی کم مدت کے اندر اندر جزیرۃ العرب کے قبائل و عشائر صلح و سلامتی کے معاہدات کے لئے مدینہ میں جوق در جوق آنے لگے۔

3- اب آیئے ان قرائن کی بجائے زیر بحث مسئلہ کے بارے میں ایک اور حوالے سے کلام اللہ سے راہنمائی حاصل کریں۔ یہ دیکھیں کہ جب حیوان لا یعقل کو مخاطب بنا کر اسے کوئی حکم دیا جاتا ہے تو اس صورت میں صیغے مذکر کے استعمال کئے جاتے ہیں یا مونث کے؟ ہمارا خیال ہے کہ اس کے بعد کوئی مومن بالقرآن تو مکابرہ کرنے کا سوچ بھی نہیں

سکے گا اور اگر کوئی ایمان بالقرآن ہی سے خالی ہو تو اس کی بات دوسری ہے۔ ارشاد الٰہی ہے۔ واوحیٰ ربک الی النحل ان اتخذی من الجبال بیوتا 16/68۔ ثم کلی ..... فاسلکی سبل ربک ..... 16/69۔

غور کیجئے۔ یہاں پر خطاب شہد کی مکھیوں کو بطور جنس کے ہے۔ کیونکہ النحل کے بعد تائے وحدت یا تائے تانیث موجود نہیں ہے اور النحل کا وزن ٹھیک طور پر وہی ہے جو کہ النمل 18-27/17 کا ہے۔ اب غور کیجئے۔ کلام اللہ میں تین فعل امر استعمال ہوئے ہیں۔ یعنی اتخذی۔ بنالو یا پکڑو۔ اختیار کرو۔ کلی۔ کھاؤ۔ فاسلکی۔ چلو۔ لیکن یہ تینوں افعال امر مذکر نہیں بلکہ واحد مونث کے طور پر لائے گئے ہیں۔ پھر غور کیجئے۔ سبل ربک۔ اپنے رب کے راستوں پر۔ کے الفاظ میں ربک کہا گیا ہے۔ نہ کہ ربکم۔ پس اگر 18-27/17 میں النمل سے مراد چیونٹیاں ہوتیں اور لایعقل حیوانوں کو خطاب ہوتا۔ تو عربی عبارت یوں ہوتی کہ۔ یاایتھا النمل ادخلی فی مساکنک وغیرہ لیکن ایسا نہیں ہے۔ بلکہ مذکر عاقل کے صیغوں اور ضمائر کا استعمال ہونا اس بات کا ثبوت ہے کہ یہاں پر صاحب اختیار وارادہ ذی شعور مخلوق کا کلام ہے اور وہ سوائے انسان کے کوئی دوسری مخلوق نہیں ہے۔

لہٰذا اگر جناب پرویزؒ صاحب نے اس مقام پر اسے حیوان لایعقل کا کلام نہیں مانا۔ تو یہ ان کے ہوشمند۔ صاحب بصیرت مفکر ہونے کی دلیل ہے نہ کہ نعوذ باللہ ان کے گمراہ ہونے کا اعلان بلکہ معاملہ اس کے بالکل برعکس ہے۔ وہ لوگ جو کہ اسے حیوان لایعقل کا کلام نہ صرف خود مانتے ہیں بلکہ دوسروں سے بھی ایسا منوانے پر مصر ہیں۔ وہ دشمنان امت و ملت اسلامیہ نہیں چاہتے کہ اس امت کی دنیا میں دوبارہ عقل وخرد کا آفتاب فرقان طلوع ہو کہ جس کے نتیجہ میں یہ ظلمات کافور ہوں اور انوار وتجلیات کے ظہور سے دوبارہ یہ امت اور پھر کل انسانیت بقعہ انوار اور مطلع تجلیات بن جائے۔

ایک اور اشکال اور اس کا جواب: مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس غلط فہمی کا بھی صفایا کر دیا جائے کہ جس کی وجہ سے ان اصحاب نملیۃ کو دھوکا لگا ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ قوم نمل کی طرف منسوب عورت کو نملیۃ کہنا چاہئے تھا ہم کہتے ہیں۔ برادرم ذرا سوچ سمجھ کر بات کریں۔ غور کریں اس صورت میں نملیۃ کے لفظ میں دونوں احتمالات پائے جاتے ہیں یعنی کوئی مونث جو کہ نملہ کی قوم میں سے ہو اور وہ بھی کہ جو اس کی طرف کسی بھی حوالے سے منسوب ہو۔ خواہ وہ حقیقی طور پر اس میں سے ہو یا نہ ہو۔ حقیقت یہ ہے کہ یہاں پر یائے نسبت کا مقام ہی نہ تھا۔ اللہ تعالیٰ نے یہاں پر نملۃ کے ساتھ جو تنوین استعمال کی ہے اس کا اصل مقصد تفخیم اور عظمت شان کو ظاہر کرنا ہے اور اس طرح اس مقام پر نملۃ کے ساتھ تائے تنوین لانے سے مراد الٰہی یہ ہے کہ وہ نملہ قوم نملۃ میں عظیم الشان حیثیت کی مالک تھی اور بس۔

باقی رہا یہ سوال کہ آیا عربی زبان میں تنوین تفخیم یا عظمت شان کے لئے استعمال ہوتی ہے یا نہیں۔ تو ہمارا جواب ہے کہ ہوتی ہے اور کوئی ایسا شخص جو عربی زبان سے ابتدائی طور پر بھی شدھ بدھ رکھتا ہو وہ اس کا انکار نہیں کر سکتا۔ لیکن اگر ہمارے ندیم کو اس سے انکار ہوگا تو ہم اس کے لئے مغنی اللبیب اور اس جیسی مستند کتابوں سے شہادات و

نظائر پیش کر دیں گے۔ نیز یاد رہے کہ سورۃ الجن میں اللہ تعالیٰ نے جنات کے حوالے سے جو کچھ بیان فرمایا ہے۔ ان اقوال کی نسبت کے بارے میں ہمارے ہاں علمی حلقوں میں ایک بہت بڑی غلطی پائی جاتی ہے۔

مفسرین قرآن نے یہ تاثر دے رکھا ہے کہ یہ سارے کا سارا جنات کا بیان ہے۔ حالانکہ یہ جنات نہیں۔ بلکہ اللہ تعالیٰ کا ان کے بارے میں اعلان ہے۔ یہاں تو ہم نے یہ بتانا ہے کہ سورۃ الجن میں اہل کتاب کی نصرانی یا مسیحی شاخ کے ان عقائد پر الٰہی تنقید ہے کہ جو انہوں نے توحید خالص سے انحراف کر کے شرک میں مبتلا ہو کر اختیار کر رکھے تھے۔

استدراک: مناسب معلوم ہوتا ہے کہ زیر بحث مضمون کی مناسبت سے جنات کے حوالے سے ایک اور غلط فہمی کا بھی ازالہ کر دیا جائے۔ عوام الناس ہی میں نہیں بلکہ مذہبی حلقوں کے علمائے افاضل میں بھی یہ غلط خیال نہایت گہری جڑ پکڑ چکا ہے کہ جنات عالم الغیب ہوا کرتے ہیں۔ اسی لئے ایسے مذہبی لوگ کہ جن کا دعویٰ ہوتا ہے کہ انہوں نے کسی جن کو مسخر کر رکھا ہے ان کے پاس گم شدہ چیزوں کے بارے میں معلومات حاصل کرنے والوں کا تانتا بندھا رہتا ہے۔ ان لوگوں کا دعویٰ ہوتا ہے کہ ان کے پاس جو جن مسخر ہے وہ انہیں دنیا جہان کی خبریں آ کر بتاتا ہے۔ اس کے ساتھ یہ بھی ہمارا مشاہدہ ہے کہ جب یہ لوگ کسی کے اندر سے جن کو نکالنے کا دعویٰ کرتے ہیں تو اس سے یہ لوگ سیدنا سلیمانؑ کے نام کی قسم لیتے ہیں کہ وہ دوبارہ اس عورت یا مرد کو آ کر نہیں چمٹے گا۔ وجہ یہ بتاتے ہیں کہ چونکہ سلیمانؑ جنات کے بادشاہ تھے۔ یہ جنات ان کے لئے مسخر کئے گئے تھے۔ لہٰذا ان پر آج تک سلیمانی حکمرانی کا رعب و دبدبہ قائم ہے۔ آیئے اس حوالے سے مذہبی پیشوائیت کے اس مزعومہ خیال کے بارے میں کہ جس میں عوام الناس ہی نہیں بلکہ جید علمائے کرام بھی مبتلا ہیں۔ کلام اللہ سے راہنمائی حاصل کریں۔ قرآن حکیم سورۃ السباء میں ارشاد فرماتا ہے۔ ما دلھم علیٰ موتہ الا دآبۃ الارض تاکل منسأتہ فلما خر تبینت الجن۔ ان لو کانوا یعلمون الغیب ما لبثوا فی العذاب المھین 34/14۔ پس ان کے لئے اس کی موت کی جانب سوائے اس دابۃ الارض کے کوئی دوسرا امر راہنمائی نہ کر سکا۔ کہ جو اس کی حکومت وسلطنت کے اسباب وعوام کو چٹ کر چکا تھا۔ جب اس کی حکومت وشوکت کا ڈھانچہ بالکل ہی گر گیا۔ تو جنات کہنے لگے کہ اے کاش کہ انہیں علم غیب ہوتا۔ تو وہ اس صورت میں اس اہانت آمیز صورت احوال میں مبتلا نہ رہتے۔ اب آپ ذرا الٰہی الفاظ کا مشاہدہ کریں اور دیکھیں کہ کس طرح اللہ تعالیٰ دوٹوک الفاظ میں سلیمانی جنات کی زبان سے اس امر کا اعتراف واعلان کروا رہے ہیں کہ وہ عالم الغیب نہ تھے۔ فرمایا جا رہا ہے کہ ان جنات نے کہا کہ اے کاش کہ انہیں علم غیب ہوتا۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ جنات کو علم غیب نہیں۔ بلکہ مزید برآں یہ کہ زمین و آسمان میں اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی دوسرا غیب دان ہے ہی نہیں 27/65 حتیٰ کہ رسول اللہ بھی عالم الغیب نہ تھے 6/50, 7/188 لیکن یہ مذہبی پیشوا ہیں کہ ان سلیمانی جنات کو عالم الغیب مان رہے ہیں کہ جن کا اپنا اعتراف ہے کہ انہیں قطعاً الغیب کا علم نہیں ہے۔

اس سے یہ بات روز روشن کی طرح عیاں ہو جاتی

ہے کہ علامہ محمد اقبالؒ کا یہ کہنا کہ

مکتب و ملا و اسرار کتاب
کور مادر زاد و نور آفتاب

سو فیصد درست ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ ہماری مذہبی پیشوائیت صدیوں سے قرآنی حقائق و معارف سے اپنا رشتہ منقطع کر کے انسانوں کی خود ساختہ و خود تراشیدہ روایات کی بھول بھلیوں میں اس حد تک کھو چکی ہے کہ اب اس کی اور قرآن پاک کی بتائی ہوئی حقیقتوں میں بعد المشرقین پیدا ہو چکا ہے۔ اس نے اللہ تعالیٰ کے عطا کردہ ضابطہ حیات کو جو حیات بخش بھی ہے اور خرد افروز بھی، مُردوں اور قبرستانوں کے لئے وقف کر رکھا ہے۔ اس کے نتیجہ میں پورا عالم اسلامی آج ایک تنگ و تاریک قبرستان کا سماں پیدا کئے ہوئے ہے۔ خلاصہ کلام یہ کہ علامہ پرویزؒ صاحب نے حیات افزا اور خرد افروزی کی جو تحریک برپا کی ہے کہ جس کے نتیجہ میں آہستہ آہستہ عالم اسلامی میں دوبارہ قرآنی آفتاب کی کرنوں نے اپنی ضو افشانی شروع کر دی ہے۔ اب آہستہ آہستہ نور و ظلمت میں کشمکش شروع ہو چکی ہے۔ کتاب اللہ کی طرف پیش قدمی کا عمل شروع ہو کر فروغ پذیر ہو رہا ہے۔ جس سے جن بھوت اور ان کے قصوں کہانیوں کے نام پر پیدا کردہ دھند اور کہر آہستہ آہستہ دبے پاؤں بھاگنا شروع کر چکی ہے۔ لیکن ظلمت خواہ قوتیں فکر پرویزؒ کی قرآنی مشعل کی کرنوں کے فروغ و اشراق کے راستے میں حائل ہونے کی کوشش میں مصروف ہیں۔ لیکن ظلماتی قوتیں کب تک اس نجم ثاقب کی نفوذ پذیر اور پردہ شکن قوت الٰہی کا مقابلہ کرتی رہیں گے۔ آخر کار ان کی موت بہر حال یقینی ہے۔

انکارِ سنت اور پرویزؒ صاحب: یہ موضوع جس قدر اہمیت کا حامل ہے اور امت اسلامیہ کی طرف اپنے آپ کو منسوب کرنے والے فرقوں یا بزعم خویش مکاتب فکر نے اس کے بارے میں جو افراط و تفریط روا رکھی ہوئی ہے، اس کا تقاضا ہے کہ اس موضوع پر کھل کر ذرا تفصیل سے گفتگو کی جائے۔ پھر اس حوالے سے ائمہ فقہ نے ماضی میں جو جو موقف اختیار کئے تھے اور جن کے اثرات کی چھاپ آج بھی ابنائے ملت کے قلوب و اذہان پر صاف دکھائی دے رہی ہے۔ اس پر بھی گفتگو کی جائے اور خود عصر حاضر میں مصور پاکستان جناب علامہ محمد اقبالؒ نے اپنے خطبات میں جو موقف جن براہین و دلائل کی بنیاد پر در بارہ حدیث اختیار کیا تھا اسے بھی زیر بحث لایا جائے تاکہ یہ پتہ چل سکے کہ حدیث کے باب میں جناب علامہ غلام احمد پرویزؒ نے جو موقف اختیار کیا ہے وہ اس میں تفرد و انحراف کا شکار ہوئے ہیں یا وقت کے قابل اعتماد اور ثقہ مفکرین اسلام اور ان کے ترجمان کی رائے بھی در بارہ حدیث وہی ہے جو علامہ غلام احمد پرویزؒ صاحب کی ہے۔ ہم نے جہاں تک پرویزؒ صاحب کی کتب و مقالات اور تحاریر و تقاریر کا مطالعہ کیا ہے۔ اس کی بنیاد پر ہمارا دعویٰ ہے کہ آپ نے کبھی بھی حدیث یا سنت کا انکار نہیں کیا۔ طلوع اسلام نے حدیث کے حوالے سے جو بنیادی کتاب لکھی ہے وہ بھی مقام حدیث کے عنوان پر لکھی ہے نہ کہ انکار حدیث کے عنوان سے۔ گویا وہ اس باب میں جو کچھ چاہتے ہیں وہ یہ کہ اس امر کا تعین کیا جائے کہ دراصل حدیث کا مقام و منصب ہے کیا؟ یعنی حدیث کتاب اللہ کے بعد ہے یا اس سے پہلے۔ حدیث کتاب اللہ پر حاکم اور اس کی ناسخ ہے یا اسے کتاب اللہ کے ساتھ ایک ماتحت اور خادم کی حیثیت حاصل ہے۔ پرویزؒ صاحب کا نقطہ نظر یہ ہے کہ

حدیث کتاب اللہ کی نہ ناسخ ہے اور نہ ہی وہ ناسخ ہوسکتی ہے۔ کیونکہ حدیث کے باب میں سب سے پہلا تو یہی سوال پیدا ہوتا ہے کہ اس کی نسبت الی الرسولؐ روایتاً و درایتاً ثابت بھی ہے یا کہ نہیں۔ جب کہ ناسخ قرآن ہونے کا مقام و منصب تو خود رسولؐ اللہ کو بھی حاصل نہ تھا۔ وہ بھی بنفس نفیس اپنی حیات طیبہ میں اول سے لے کر آخر تک کتاب اللہ کے ماتحت اور اس کے تابع تھے دیکھئے (6/50, 10/15-16) تو جب رسولؐ اللہ خود ہی کتاب اللہ کے ماتحت اور اس کے تابع تھے تو ان کی طرف منسوب وہ اقوال کہ جن کی نسبت کا تحقق ہی ایک متنازعہ فیہ امر ہے انہیں ناسخِ کتاب اللہ کا مقام کیسے دیا جاسکتا ہے۔ پس حدیث ہو یا سنت اس کا درجہ کتاب اللہ کے بعد کا ہے۔ وہ کتاب اللہ کے ماتحت ہے نہ کہ اس کے اوپر۔ یعنی یہی موقف پرویزؒ صاحب کا ہے اور خود یہی موقف احادیث سے ثابت ہوتا ہے۔ اس حوالے سے بہت مشہور حدیث نبویؐ ہے کہ جب رسول اکرمؐ نے جناب معاذؓ بن جبل کو یمن کا قاضی یا گورنر بنا کر بھیجنا چاہا تو آپؐ نے ان سے پوچھا کہ تم لوگوں کے مابین فیصلے کیسے کیا کروگے تو انہوں نے جواب دیا کہ اقضی بکتاب اللہ۔ کہ میں کتاب اللہ کے مطابق فیصلے کیا کروں گا۔ پھر آپؐ نے فرمایا کہ ان لم تجد۔ کہ اگر تجھے وہاں اس حوالے سے کچھ نہ ملے تو پھر کیا کروگے۔ تو انہوں نے جواباً عرض کیا کہ اقضی بسنت رسولہؐ۔ کہ تب میں سنت رسولؐ اللہ کی بنیاد پر فیصلے کیا کروں گا۔ پھر آپؐ نے پوچھا کہ فان لم تجد۔ کہ اگر تجھے وہاں بھی کچھ نہ ملے تو پھر کیا کروگے۔ تو انہوں نے عرض کیا کہ ثم اجتھد برای۔ کہ پھر میں اس معاملے میں مزید غور وخوض کروں گا اور اس کی بنیاد پر فیصلے کیا کروں گا۔ اسے سن کر رسولؐ اللہ نے اپنے قاضی کو دعا دی اور وہ اللہ تعالیٰ کا شکر بجا لائے۔ کہ ان کی تعلیم و تربیت سے ایسا فہم اور ایسی بصیرت امت کے قاضیوں اور گورنروں کے قلوب واذہان میں راسخ ہوگئی ہے۔ یہ اور اس طرح کی مسلمہ نبویؐ احادیث سے یہ بات روز روشن کی طرح ثابت ہو جاتی ہے۔ کہ حدیث یا سنت کی ضرورت اس وقت پڑے گی جب ہمیں کسی مسئلہ میں کتاب اللہ سے اصولی طور پر نفیاً یا اثباتاً کوئی راہنمائی نہ مل سکے۔ لیکن اگر کتاب اللہ سے کسی مسئلے یا عقیدے پر دو اور دو چار کی طرح واضح و دوٹوک انداز میں راہنمائی مل رہی ہو تو اس کے ہوتے ہوئے یا اسے نظر انداز کرتے ہوئے ایسی روایات کو اپنے سینوں کی زینت بنالینا جو عصمت انبیاء کو بھی داغدار کرتی ہوں، محمد رسول اللہ ﷺ والذین معہٗ کو بھی مخالف قرآن ثابت کرتی ہوں۔ جو امت اسلامیہ میں اختلاف و تفرقہ کا باعث بن رہی ہوں۔ جن کے ہوتے ہوئے امت کی صفوں میں اتحاد و وحدت کا پیدا کرسکنا محالات میں نظر آرہا ہو۔ پس ایسی احادیث کی نسبت الی الرسول ﷺ کو تسلیم نہ کرنا قطعاً انکار سنت کے مترادف نہیں ہے کہ جس کو بنیاد بنا کر محترم علامہ غلام احمد پرویزؒ صاحب کو بدنام کرنے کے لئے صفحات کے صفحات سیاہ کرکے اپنے لئے روسیاہی کا سامان پیدا کرلیا جائے۔ ہم نے آغاز میں کہا ہے کہ یہ موضوع دور حاضر میں اپنے ماضی کی بہ نسبت کچھ زیادہ ہی اہمیت حاصل کر چکا ہے۔ لہٰذا اس کا تقاضا ہے کہ اس پر ذرا تفصیل سے گفتگو کی جائے تاکہ اس باب میں علامہ غلام احمد پرویزؒ صاحب نے جس مسلک اعتدال کی ترجمانی کی ہے۔ اس کی قدر و قیمت سے ہمارے قارئین ہی نہیں بلکہ

ہمارے ناقدین بھی پوری طرح باخبر ہوسکیں۔ لیکن اس موضوع پر تفصیلی گفتگو کرنے سے پہلے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ حدیث وسنت کی بحث کو جن بنیادوں پر اٹھانے کی کوشش کی جاتی ہے پہلے ہم ان کا جائزہ لینے کی کوشش کریں۔ لہٰذا ہم نے اس کا آغاز اسوۂ رسول اللہ اور اتباع و اطاعت رسول اللہ ﷺ جیسے بنیادی مباحث سے کرنا مناسب سمجھا ہے۔ کیونکہ اگر یہ ابتدائی گذارشات ہمارے قلوب واذہان میں کلام اللہ کی بنیاد پر جڑ پکڑ گئیں تو سنت یا حدیث کے باب میں اگلے مباحث کو کما حقہٗ طور پر سمجھ لینا کچھ مشکل نہیں رہے گا۔

اسوۂ رسولؐ اللہ اور قرآنِ حکیم: جب کبھی حدیث یا سنت کے موضوع پر گفتگو کی جاتی ہے، تو فوراً اہل روایات اسوۂ رسولؐ اللہ کی بحث کو درمیان میں لے آتے ہیں۔ احادیث وروایات کی حجیت شرعیہ کو منوانے کے لئے وہ فوراً سوال کر دیتے ہیں کہ بتائیے۔ آپ لوگ کیا رسولؐ اللہ کے اسوہ کے منکر ہیں۔ کیا قرآنِ حکیم میں اسوۂ رسولؐ اللہ کو اختیار کرنے یا اس پر چلنے کا اللہ تعالیٰ نے ہمیں پابند نہیں ٹھہرایا ہے (33/21-22)۔ قرآنِ حکیم نے جب ہم کو رسولؐ اللہ کے اسوہ پر چلنے کا پابند ٹھہرایا ہے تو اس صورت میں وہ اسوہ حاصل کرنے کے لئے کیا ہم بیرون قرآن جانے پر مکلف نہیں ٹھہرائے گئے؟ آیئے قرآن حکیم کی روشنی میں اس سوال کے جواب کو پانے کی کوشش کریں۔ اس سوال کا قرآنی جواب یہ ہے کہ اسوۂ رسولؐ اللہ کو حاصل کرنے کے لئے ہمیں بیرون قرآن جانے کی کچھ ضرورت نہیں ہے۔ اتباع قرآن ہی میں اتباع الرسولؐ اور ان کے اسوۂ حسنہ کی اتباع مضمر ہے۔ مثلاً قرآن حکیم میں رسولؐ اللہ کے حوالے سے بیان فرمایا گیا ہے کہ۔ ان اتبع الا ما یوحی الی قل ھل یستوی الاعمی والبصیر افلا تتفکرون (6/50)۔ کہ میں صرف اس چیز کی اتباع کرتا ہوں جو اللہ تعالیٰ نے میری جانب وحی کی ہے۔ کہہ! کیا بھلا اندھا اور آنکھوں والا برابر ہوسکتا ہے۔ کیا بھلا تم عقل سے کام نہیں لیتے۔ اور اس وحی کے بارے میں ارشاد فرمایا ہے کہ واوحی الی ھذا القران (6/19)۔ کہ جو کچھ مجھے بطور وحی عطا کیا گیا ہے وہ تو یہ قرآن ہے۔ پس معلوم ہوا کہ محمدؐ رسول اللہ چونکہ وحیٔ قرآن کی اتباع کیا کرتے تھے لہٰذا آپ کا نمونہ ہمارے لئے یہی ہے کہ ہم بھی آپ کی اتباع کرتے ہوئے قرآن پاک کی اتباع کرتے رہیں۔ باقی رہا یہ کہ آپ ﷺ کا یہ اسوہ، کتب روایات کے حوالے سے ہے اور آپ کی اتباع سے مراد کتب احادیث کی اتباع ہے، تو ہمارے نزدیک یہ تصور خلاف قرآن ہونے کی وجہ سے قابل تسلیم نہیں ہے۔ یہ تصور کیسے خلاف قرآن ہے۔ ہم اس کی وضاحت کے لئے چند ایک دلائل کا حوالہ دینا مناسب خیال کرتے ہیں۔

1- جس طرح اللہ تعالیٰ نے ہمارے لئے اسوۃ رسولؐ اکرم کو لازم ٹھہرایا ہے (33/21)۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ نے اہل ایمان کے لئے سیدنا ابراہیمؑ والذین معہٗ کا اسوۂ حسنہ بھی لازم ٹھہرایا ہے۔ (60/4-5)۔ تو اب سوچنے والی بات یہ ہے کہ کیا ان کے اسوہ کو حاصل کرنے کے لئے ہمیں صحف ابراہیمؑ کو تلاش کرنا ہوگا اور اگر وہ اپنی صحیح واصل حالت میں نہ مل سکیں (جس کا اب امکان ہے ہی نہیں) تو کیا اس صورت میں ہمیں از خود عن فلاں عن فلاں کے سلسلۂ اسناد سے اکٹھا کر کے ان کی اتباع کرنے کے لئے اپنے

آپ کو مکلّف ٹھہرانا ہوگا۔ بات بڑی واضح ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ہمیں اس جھنجھٹ میں نہیں ڈالا۔ سیدنا ابراہیمؑ والذین معہٗ کا جو اسوہ ہمارے لئے لازم تھا اللہ تعالیٰ نے متفرق مقامات پر اسے مختلف مناسبتوں سے کتاب اللہ میں ذکر کر دیا ہے۔ لہٰذا ان متعلقہ مقامات کو یکجا کر کے سیدنا ابراہیمؑ و والذین معہ کا وہ اسوہ اکٹھا ہوسکتا ہے اور اس کی اتباع ان کی اسوہ کے اتباع کہلائے گی۔ مثلاً دیکھئے (60/4) میں جہاں اس اسوۃ کی اتباع کو بیان کیا ہے تو ساتھ ہی وہاں 'اذ' کے بعد لا کر اسے بیان کر دیا ہے یعنی فرمایا گیا ہے کہ وہ اسوہ یہ ہے کہ جب انہوں نے اپنی جماعت کے ساتھ اہل کفر سے یوں اور یوں کہا یعنی جو کچھ انہوں نے کہا تھا اسے متعلقہ مقام پر اللہ تعالیٰ نے خود بیان کر دیا ہے تا کہ اہل ایمان کو کتاب اللہ سے باہر جانے کی احتیاج محسوس نہ ہو۔ اور اس طرح کتاب اللہ کا استقلال اور اس کا خود مکتفی ہونے کا دعویٰ کسی حوالے سے بھی مجروح نہ ہو۔ مزید برآں قرآن میں اللہ تعالیٰ نے ہمیں خبر دی ہے کہ جو کچھ قرآن حکیم میں تمہیں تعلیم دی گئی ہے' یہی تعلیم سیدنا ابراہیمؑ اور سیدنا موسیٰؑ کے صحیفوں میں موجود تھی (87/19)۔ پس جب ہم قرآن پاک کی اتباع کرتے ہیں' تو ہم نہ صرف سیدنا ابراہیمؑ وسیدنا موسیٰؑ کی اتباع کے شرف سے بھی بہرہ ور ہو جاتے ہیں۔ بلکہ اس کے نتیجہ میں ان پر نازل ہونے والے صحیفوں کی اتباع کے مثبت و تعمیری نتائج وثمرات سے بھی بہرہ ور ہو جاتے ہیں۔ لہٰذا سوچنے والی بات یہ ہے کہ جب اللہ تعالیٰ نے قرآن حکیم کی اتباع کرنے سے ہمیں ان حضرات کے صحیفوں کی اتباع سے مستغنی کر دیا ہے اور قرآن پاک کی موجودگی میں ہمیں ان حضرات کے ان صحیفوں کی کچھ حاجت نہیں رہتی کہ جنہیں اللہ تعالیٰ نے خود نازل کیا تھا اور اس طرح اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب کے استقلال اور عدم احتیاج کو بڑے شد و مد سے ثابت کر دکھایا ہے۔ تو کیا اس کے بعد انسانوں کی جمع کردہ روایات کی کتاب اللہ یعنی قرآن پاک کے بعد کچھ بھی حاجت وضرورت باقی رہ جاتی ہے۔ نہیں اور ہرگز نہیں۔ پس جس کتاب عظیم کی اتباع کرنے سے ہم صحف ابراہیمؑ وصحف موسیٰ کی تلاش سے بے نیاز کئے گئے ہیں۔ اس کتابِ عظیم کی موجودگی میں ہم یقیناً انسانی جدوجہد سے مرتب ہونے والی کتبِ روایات کے جمع وتدوین اور اس کی حفاظت و اتباع سے بھی یقیناً محفوظ کر دیئے گئے ہیں۔

2- اسی طرح اس پر اس حوالے سے بھی غور کریں کہ اللہ تعالیٰ نے سورۃ الانعام میں سیدنا نوحؑ سے لے کر سیدنا مسیحؑ ابن مریم تک کے انبیاء و رسل کا حوالہ دے کر ارشاد فرمایا ہے کہ اولٰئک الذین ھدی اللہ فبھدٰھم اقتدہ (6/90)- یہ وہ لوگ تھے کہ جنہیں اللہ تعالیٰ نے ہدایت یافتہ قرار دیا پس آپؐ ان کی ہدایت کی پیروی کریں۔ اب یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ ان انبیاء کی پیروی کیسے کی جائے۔ کیا ان کی پیروی کرنے کے لئے ان کے صحیفوں کو تلاش کیا جائے یا ان کی طرف منسوب امتوں کے علمی ورثہ اور ان کے علماء کی طرف رجوع کیا جائے۔ ظاہر بات ہے کہ اگر یہ امت سابقہ امتوں کے علماء اور ان کے پاس موجود روایتوں کی تلاش میں نکل پڑے تو پھر یہ اپنی آخری کامل ومکمل کتاب کی کیا اتباع کرے گی اور اس صورت میں کیا یہ ابدی کلام الٰہی کی ناقدری کرنے کی مرتکب نہ ہوگی۔ اس لئے قرآن پاک کی اتباع کے بعد امت کو کسی اور کتاب کی اتباع کی قطعاً کوئی کچھ حاجت نہیں رہتی۔ دلیل

کے لئے اس امر پر غور فرمائیں یعنی اسی مقام (6/91) سے ذرا پہلے یوں ارشاد فرمایا گیا ہے۔ ذلک ھدی اللہ یھدی بہ من یشاء من عبادہ (6/89)۔ یہی ہے اللہ تعالیٰ کی وہ ہدایت (ہدایت قرآن) کہ جس کے ذریعہ اللہ تعالیٰ اپنے بندوں میں جسے اس کے مطابق پاتا ہے اسے ہدایت یافتہ قرار دے دیتا ہے۔ پس وہ ہدایت ابدی کہ جس کے ذریعے اللہ تعالیٰ نے سابق ادوار میں انبیاؑء اور ان کی امتوں کو ہدایت دی تھی' وہ یہی قرآنی ہدایت تھی۔ یہی قرآنی ہدایت سابق انبیاؑء کے صحیفوں میں تھی۔ جیسا کہ ارشاد فرمایا گیا ہے کہ ان ھذا لفی الصحف الاولی o صحف ابراہیم و موسی (87/18-19)۔ بے شک یہی تعلیمات (قرآنی تعلیمات) پہلے صحیفوں میں بھی موجود تھیں جیسا کہ ابراہیمؑ اور موسیٰؑ کے صحیفوں میں۔ پھر سورۃ الشعراء میں ارشاد فرمایا گیا ہے کہ اولم یکن لھم اٰیۃً ان یعلمہ علموا بنی اسرائیل (26/197)۔ اور کیا یہ ان کے لئے ایک بہت بڑا نشان صداقت نہیں کہ اسے (قرآن) بنی اسرائیل کے علماء بھی خوب جانتے ہیں۔ پھر سورہ طٰہٰ میں ارشاد ہوا ہے کہ وقالوا لولا یاتینا باٰیۃ من ربہ اولم تاتھم بینۃ ما فی الصحف الاولیٰ (20/133)۔ اور وہ کہتے ہیں کہ یہ (رسولؐ) اپنے رب کی جانب سے کوئی نشان کیوں نہیں لایا۔ کیا بھلا ان کے پاس سابق صحیفوں کے نشانات و دلائل نہیں پہنچ گئے۔ غرضیکہ قرآن حکیم میں نہ صرف سابقہ صحیفوں کی وہ بنیادی اور مرکزی تعلیمات محفوظ کر دی گئی ہیں کہ جن کی نوع انسانی کو بالعموم اور امت مسلمہ کو بالخصوص ضرورت پڑ سکتی تھی۔ مزید برآں یہ کہ اس میں وہ تمام دلائل بھی یکجا کر کے محفوظ کر دیئے گئے ہیں کہ جو متفرق اوقات میں مختلف اقوام کو انفرادی طور پر عطا کئے گئے تھے تاکہ اس طرح یہ امت محمدیہ کہ جسے امت وسط ہونے کا مقام و منصب عطا کیا گیا ہے وہ تمام اقوام عالم پر ان کی زبان میں اور ان کے مانوس دلائل کی بنیاد پر دعوت و تبلیغ قرآن کے محاذ پر اتمام حجت کا فریضہ انجام دے سکے۔

3- مزید برآں یہ کہ آپ اس نکتہ پر بھی غور کریں کہ (6/91) میں انبیاء اور رسل کی شخصی اتباع واقتداء کا حکم نہیں دیا گیا۔ بلکہ اس ہدایت کی اتباع واقتداء کا حکم دیا گیا ہے کہ جو انہیں اللہ تعالیٰ کی جانب سے عطا کی گئی تھی۔ جیسا کہ ارشاد فرمایا گیا ہے کہ اولٰئک الذین ھدی اللہ فبھداھم اقتدہ (6/91)۔ یہ وہ لوگ (مراد انبیاؑء اور ان کی ہدایت یافتہ امتیں) ہیں۔ کہ جنہیں اللہ تعالیٰ نے ہدایت یافتہ بنایا۔ پس آپؐ ان کی ہدایت کی اقتدا کرتے رہیں۔ یہاں پر اللہ تعالیٰ کے ان الفاظ پر ذرا غور کریں۔ فرمایا جا رہا ہے کہ انہیں اللہ تعالیٰ نے ہدایت عطا کی۔ اس نے انہیں ہدایت یافتہ بنایا اور یہ تو ہمیں معلوم ہی ہے کہ اللہ تعالیٰ شریعت کے حوالے سے ہدایت ہمیشہ اپنی کتاب کے ذریعہ ہی دیا کرتا ہے۔ گویا انہیں اللہ تعالیٰ نے ان کے اپنے اپنے وقت پر کتاب شریعت عطا کر کے ہدایت یافتہ بنایا۔ پس جس اللہ تعالیٰ نے انہیں ہدایت یافتہ بنایا' وہی اللہ الحی القیوم آج بھی زندہ اور زندگی عطا کرنے والا ہے۔ وہ کل بھی اپنی کتاب کے ذریعہ ھادی تھا آج بھی وہی اللہ اپنی آخری کامل و مکمل کتاب الھدیٰ کے ذریعہ ہدایت عطا کرنے والا ہے۔ پھر ارشاد فرمایا گیا ہے کہ تم ہدایت الٰہی

کی اقتداء کرتے رہو۔ گویا اقتداء کتاب الھدیٰ کی ہے۔ نہ کہ انبیاء کی شخصی اقتداء۔ اس طرح تمام مخلوق اپنے خالق و مالک کی ہدایت کی محتاج ہے۔ تمام نبیؑ' ولی ایک ہی ذات کے محتاج ہیں اور تمام نوع انسانی اور کل کی کل امت مسلمہ بھی امور ہدایت میں اس ہادیٔ برحق' اللہ رب العزت ہی کی محتاج ہے۔ نیز ارشاد فرمایا گیا ہے کہ اقتدہ کہ اس کی اقتداء یعنی پیروی کر لیکن یوں نہیں فرمایا گیا کہ اقتدھم ان (نبیوں) کی اقتداء کر۔ اگر نبیوں کی اقتداء کرنی مطلوب ہوتی۔ تو قرآن حکیم کے الفاظ اقتدھم ہوتے۔ جبکہ ایسا نہیں ہے۔ پس اس سے روز روشن کی طرح عیاں ہو گیا کہ اقتداء اس کتاب الھدیٰ کی ہے' جو ان نبیوں کی طرف نازل کی گئی تھی۔

پس معلوم ہوا کہ رسول اللہ کو جو چیز رسول بناتی ہے۔ وہ وحی و کلام الٰہی ہوتا ہے۔ اس وحی سے رسول کی زندگی دو حصوں میں تقسیم ہوتی ہے۔ وحی و رسالت سے قبل کی زندگی دوسری وحی کے بعد کی زندگی۔ رسول پر جو وحی نازل ہوتی ہے' اس پر وہ نبی بھی دوسرے اہل ایمان کی طرح ایمان لاتا ہے۔ امن الرسول بما انزل الیہ من ربہ والمومنون (2/285)۔ اور اس پر بھی دوسرے اہل ایمان کی طرح اس وحی کی اتباع واجب ہوتی ہے۔ اتبع ما اوحی الیک من ربک لا الہ الا ھو واعرض عن المشرکین (6/107)۔ اور جو کچھ آپؐ کی جانب آپؐ کے رب کی طرف سے وحی کیا گیا ہے' اس کی اتباع کرتے رہیں۔ اس اللہ تعالیٰ کے علاوہ اور کوئی صاحب الوہیت نہیں ہے اور آپؐ مشرکوں سے اپنے آپؐ کو الگ تھلگ رکھیں۔ حتیٰ کہ رسول کے ہدایت یافتہ ہونے کا سبب بھی وحی ہی ہوا کرتی ہے۔ ارشاد الٰہی ہے۔ قل ان ضللت فانما اضل علی نفسی وان اھتدیت فبما یوحی الی ربی انہ سمیع قریب (34/50)۔ کہہ! کہ اگر میں ہدایت یافتہ ہو چکا ہوں تو اس کا سبب وہ وحی ہے کہ جو میری طرف میرا رب کر رہا ہے۔ بلاشبہ وہ بڑا ہی سننے والا بڑا ہی قریب ہے۔ پس ارشادات الٰہیہ سے معلوم ہوا کہ وحی الٰہی ہی دراصل وہ شئی ہے کہ جو انبیاؑء و رسلؑ کی ہدایت کا باعث بنتی ہے اور اس پر ایمان اور اس کی اتباع ہی میں ان کے فوز و فلاح کی ضمانت پائی جاتی ہے۔ پس اس سے یہ بات بہت کھل کر واضح ہو گئی کہ وحی ہی دراصل انبیاؑء کا اسوہ ہے اور یہی محمد رسول اللہ ﷺ کا اسوہ ہے اور یہ اسوہ موجود فی القرآن ہے۔ لہٰذا ہم اسوۂ رسول کو حاصل کرنے کے لئے بیرون قرآن جانے کے قطعاً مکلّف نہیں ٹھہرائے گئے۔ ہم اہل ایمان کو اللہ تعالیٰ نے اس حوالے سے جس چیز کی اتباع کا حکم دیا ہے وہ اتباع وحی یا اتباع قرآن ہے اور بس۔ ارشاد الٰہی ہے اتبعوا ما انزل الیکم من ربکم ولا تتبعوا من دونہ اولیاء قلیلاً ما تذکرون (7/3)۔ اہل ایمان تم اس کی اتباع کرو جو تمہارے رب کی جانب سے تمہاری طرف نازل کیا گیا ہے اور اس کے ماسوائے دوسرے اولیاء کی پیروی نہ کرو۔ اگر تم نے ان اولیاء کی پیروی کی تو گویا تم اس سے کچھ فیضیاب نہیں ہوئے۔ اسوہ رسول اللہ ﷺ کی اس بحث کے دوران جن آیات مبارکہ سے استدلال کیا جاتا ہے' ان میں سے مرکزی نوعیت کی تو یہی آیت مبارکہ (33/21) ہے۔ جس کے سیاق و سباق میں رسولؐ اللہ کی

استقامت اور ثابت قدمی کا حوالہ دیا گیا ہے۔ جس میں روئے سخن اولاً منافقین کی جانب ہے کہ جنہوں نے غزوۂ احزاب میں دشمن کے بڑے بڑے لشکروں سے خوف زدہ ہو کر اسلام کے دفاع کے حوالے سے عائد ہونے والے فریضۂ جہاد سے عہدہ برآء ہونے میں تھڑدلی کا مظاہرہ کیا تھا۔ جو دشمن کے سامنے ہتھیار ڈالنے اور اہل ایمان کو ہزیمت و پسپائی قبول کر کے ذلت و نامرادی کی زندگی گذارنے کی دعوت دے رہے تھے۔ انہیں کہا جا رہا ہے کہ اے مدعیان اسلام اپنے رہبرِ اعظم محمدؐ رسول اللہ کو دیکھو کہ وہ تن تنہا دنیا جہان کے مشرکوں اور کافروں کے سامنے میدان جہاد اور معرکۂ قتال میں کوہ استقامت بن کر کھڑے ہیں۔ اگر تمہارے اندر اللہ تعالیٰ اور آخرت پر ایمان کا کوئی ادنیٰ ترین یقین بھی پایا جاتا ہے تو رسول اللہ ﷺ کے اس عملی نمونے کو اپنے اندر پیدا کر کے اللہ کے راستے میں اسی طرح کے جہاد جان و مال اور استقامت فی الدین کا مظاہرہ کرو۔ اس آیت مبارکہ (33/21) کے سیاق و سباق میں اس اسوہ کا عملی طور پر یہی سبق ہے۔ اس کا اس امر سے کوئی تعلق نہیں ہے کہ قرآن حکیم تفصیلات شریعت سے چونکہ خالی ہے' لہٰذا رسول اکرمؐ تمہارے لئے شارع ٹھہرائے گئے ہیں۔ لہٰذا وہ امر اللہ کے حوالے سے جو تمہارے لئے تفصیلات شریعت قرار دیں' انہیں قرآن ہی کی طرح نہیں بلکہ اس پر انہیں قاضی و حاکم بنا کر قرآن حکیم کو منسوخ مان کر اسے اب مجرد ایسی تلاوت کے لئے مخصوص کر لو کہ جس کا اصل مقصود اور نصب العین ایسا ثواب حاصل کرنا ہو کہ جس کے اصل مفہوم سے بھی تم آگاہ نہ ہو۔ یا ایسی تلاوت میں مستغرق رہو کہ جس کا اولین مقصد مُردوں کو ثواب پہنچانا ہو یا مرنے والوں کے لئے جان کنی کے مرحلہ کو آسان کرنا ہو۔ اس ضمن میں ہم ایک اہم قرآنی نکتہ سے اپنے برادران قرآنی و اسلامی کو آگاہ کر دینا اپنا ایمانی فریضہ خیال کرتے ہیں۔

رسولؐ اللہ امیرِ شریعت یا مامورِ شریعت: رسول اللہ ﷺ کے حوالے سے یہ اہم ترین سوال ہے کہ کیا آپؐ امیر شریعت تھے یا مامور شریعت؟ اگر آپ امیر شریعت نہ تھے تو پھر ان کے علاوہ کوئی دوسرا امیر شریعت کیسے ہو سکتا ہے۔ اگر آپ امیر شریعت نہیں بلکہ مامور شریعت تھے تو جس اللہ رب العزت نے آپ کے لئے شریعت سازی کی تھی' وہی ذات ہمارے لئے بھی شریعت ساز ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ حق التشریع یعنی شریعت سازی کا حق صرف اور صرف تنہا خالق کو حاصل ہے۔ شریعت سازی صرف اللہ تعالیٰ کا حق ہے اور کسی غیر اللہ کو خواہ وہ نبی ہو یا ولی' اصلاً شریعت سازی کا حق حاصل نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ نے غیر اللہ کو شریعت سازی کا حق دیا ہی نہیں ہے اور اللہ تعالیٰ کے اس حق کو تسلیم نہ کرنا بھی از روئے کلام اللہ شرک ہے دیکھئے (42/23)۔ اسی حوالے سے ہم کہہ سکتے ہیں کہ رسول اکرم ﷺ کا فریضہ اللہ تعالیٰ کی مقرر کردہ شریعت کو بیان کرنا' اسے سمجھانا اور اس کی تنفیذ کرنا تھا اور وہ یہ فریضۂ تنفیذ اپنے اہل ایمان ساتھیوں کے امیر یعنی امیر المومنین ہونے کے ناطے سے انجام دیا کرتے تھے۔ آپ ﷺ کا شریعت کو نافذ کرنے کا یہ فریضہ آپؐ کے انتقال کر جانے سے ختم نہیں ہو گیا بلکہ تبلیغ و تنفیذ قرآن کا یہ فریضہ بحیثیت مجموعی امت کے کندھوں پر آن پڑا ہے۔ جس سے عہدہ برآ ہوئے بغیر اس امت کا امت مسلمہ و مومنہ ہونا اللہ تعالیٰ کی نظر میں محل نظر رہے گا۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ نے امت مومنہ اس امت کو قرار دیا ہے' جو کتاب الھدیٰ پر

ایمان لاکر اس کے تقاضوں کے مطابق اپنے ہاں کتاب اللہ کی عملی طور پر تنفیذ کرے۔ اس کی حکمرانی کو عملاً قائم کرے۔ لیکن اگر وہ دعویٰ ایمان کے باوجود اس کی اپنے ہاں حکمرانی قائم نہ کرے۔ تو اللہ تعالیٰ اسے مومن ماننے کی بجائے اس کے کافر' ظالم اور فاسق ہونے کا اعلان کرتے ہیں۔ دیکھئے (5/45-46-47)۔ گویا اہل ایمان کا ایمانی فریضہ صرف یہ نہیں ہے کہ وہ کتاب اللہ پر اپنے ایمان کا اعلان کر دیں اور اسکے بعد اپنی عملی زندگی کو نظام طاغوت کے ماتحت گذارتے رہیں' اور اس میں کوئی ادنیٰ ترین ذہنی و نفسیاتی خلش اور چبھن بھی محسوس نہ کریں۔ اگر وہ طاغوت کے مقابلے میں کتاب اللہ کی حکمرانی کے قیام' ربوبیت عالمینی کے قیام' نظام عبودیت والوھیت کے قیام کے لئے جہاد یا جدوجہد نہیں کر رہے تو قرآن حکیم انہیں مومن تسلیم نہیں کرتا (4/75)۔ بہرحال اسوہ اور تفصیلات شریعت کی مناسبت سے جو سوال اٹھایا گیا تھا' جس میں یہ پوچھا گیا تھا کہ آپؐ امیر شریعت ہیں یا مامور شریعت' تو اس حوالے سے کلام اللہ ہماری یہ راہنمائی کرتا ہے کہ ثم جعلناك على شريعة من الامر فاتبعها ولا تتبع اهواء الذين لا يعلمون انهم لن يغنوا عنك من الله شيا وان الظالمين بعضهم اولياء بعض, والله ولى المتقين (45/18-19)۔ اور ہم نے آپؐ کے لئے اپنے الامر (امراللہ۔ دین اللہ) کی ایک شریعت ٹھہرا دی۔ پس آپؐ اس (شریعت) کی پیروی کرتے رہیں اور آپؐ ان لوگوں کی پیروی نہ کریں کہ جو حقیقت کا اصل علم نہیں رکھتے اور وہ اللہ تعالیٰ کے مقابلے میں یا اس کے سامنے تیرے کسی کام نہ آسکیں گے۔ بلاشبہ ظالم ایک دوسرے کے لئے مددگار ہیں اور اللہ تعالیٰ اہل تقویٰ کا سرپرست و کارساز ہے۔

اس مقام سے چند ایک امور روز روشن کی طرح واضح ہو رہے ہے۔

1- اللہ تعالیٰ نے خود اپنے امر کی شریعت طے کر رکھی ہے۔ یعنی شریعت سازی اللہ تعالیٰ نے خود کی ہے اور اس نے تمام امت یا انسانیت ہی کے لئے یہ شریعت سازی نہیں کی بلکہ اپنے رسول کے لئے بھی شریعت اسی اللہ تعالیٰ نے ٹھہرائی ہے۔ پس شریعت سازی کرنا کسی انسان کا کام نہیں خواہ وہ انسان کوئی نبی یا ولی ہی کیوں نہ ہو۔ یہ استحقاق صرف اور صرف خالصتاً اللہ تعالیٰ کا استحقاق ہے اور بس۔

2- اللہ تعالیٰ نے اپنے الامر کی جو شریعت طے کر دی ہے۔ رسول اکرمؐ کا فریضۂ منصبی اس کی اتباع یا پیروی کرنا ہے۔ ان کا کام اس کے پیچھے پیچھے چلنا ہے۔ پس جب آپؐ بھی اسی شریعت کے ماتحت اور اس کی پیروی کرنے پر مامور کئے گئے ہیں۔ تو گویا آپؐ مامورِ شریعت تھے نہ کہ امیرِ شریعت۔ پھر امت میں سے کوئی شخص بھلا امیر شریعت ہونے کا مدعی کیسے ہوسکتا ہے۔ اگر کوئی ایسا سمجھتا ہے تو یہ اس کی بھول ہے۔ اللہ تعالیٰ اس سے ہمیں بچائے رکھے۔

3- پھر ارشاد فرمایا گیا ہے کہ آپؐ اپنے مامور شریعت ہونے کے موقف پر قائم رہیں اور حقیقت اصلیہ کا علم نہ رکھنے والے جاہل آپؐ کو اس موقف سے منحرف کرنے کے لئے آپؐ پر اپنی خواہشات نفسانی کے حوالے سے جتنے بھی حملے کریں آپؐ ان کے سامنے کوہِ استقامت بن کر کھڑے رہیں۔

4- اس حقیقت کو ہمیشہ اپنے ذہن میں مستحضر رکھیں کہ

اللہ تعالیٰ کے سامنے جوابدہی کے وقت ان میں سے کوئی بھی آپ کے کسی حوالے سے کچھ کام نہ آ سکے گا۔ چونکہ اللہ تعالیٰ کے حضور میں ہماری پیشی فرداً فرداً ہو گی (6/94)۔ لہٰذا وہاں نہ تو کوئی کسی کا مددگار بن سکے گا اور نہ ہی کوئی شفیع و حمایتی بن کر اللہ تعالیٰ کے حضور میں کھڑا ہو سکے گا۔ فرمایا گیا ہے کہ اگر ظالم ایک دوسرے کے مددگار ہیں تو بھلا یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے اہل تقویٰ بندوں کا معاون و مددگار نہ ہو۔ وہ ان کی کارسازی و چارہ سازی کرے گا اور وہ انہیں اس میدان میں تنہا نہیں چھوڑے گا۔ گویا یہاں پر اللہ تعالیٰ نے اہل تقویٰ ان افراد کو قرار دیا ہے' جو شریعت الٰہیہ کے اس موقف پر قائم ہوں' کہ شریعت سازی اللہ تعالیٰ کا اختصاص ہے۔ یہ حق کسی نبی یا ولی کو حاصل نہیں۔ اسی حوالے سے نبی اکرم ﷺ بھی مامورِ شریعت ہیں نہ کہ امیر شریعت۔ اور اس موقف کو قبول کرنے میں اصل رکاوٹ انسانوں کی خواہشات حیوانیہ و نفسانیہ ہیں۔ انسان کی خواہشات نفسانیہ کا مطالبہ ہے کہ وہ اپنے لئے شریعت سازی کا مطالبہ کرے۔ لیکن انسان جب بھی اس حق کو اپنے لئے غصب کرنے کی کوشش کرے گا اس سے زمین پر فساد کے سوا کچھ ظاہر نہ ہو گا اور خشکی و تری پر غلبۂ فساد کے سوا کسی دوسری چیز کا غلبہ نہیں ہو گا۔ امور بالا سے یہ حقیقت کھل کر ہمارے سامنے آ گئی کہ قرآن فہمی کا ایک بنیادی تقاضا یہ بھی ہے کہ رسول اکرم ﷺ کے اسوہ کو موجود فی القرآن مانا جائے۔ اسوۂ رسول ﷺ کو معلوم کرنے کے لئے یا اسے متعین طور پر جاننے کے لئے بیرون قرآن ادھر ادھر جانے کی عادت کو ترک کر دیا جائے۔ جس طرح سابق انبیاء کے اسووں کو اللہ تعالیٰ نے اپنے قرآن میں محفوظ کر کے ہمیں سابقہ کتب منزلہ سے مستغنی کر دیا ہے' اسی طرح اپنے رسولؐ خاتم النبین کے اسوۂ حسنہ کو اپنے قرآن میں محفوظ کر کے ہمیں انسانی روایات کے غیر محفوظ منابع سے سیرابی کرنے سے محفوظ رکھا ہے۔ پس شریعت سازی اللہ تعالیٰ کا اختصاص ہے۔ اس شریعت کا ترجمان قرآن پاک ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے اسی چشمۂ حیواں کو جاری کر کے ہمیں اس کا سقہ بنایا ہے (22/78)۔ اللہ تعالیٰ ہمیں اس سے تا ابد سیراب ہونے اور دوسروں کو اسی چشمۂ حیواں پر لاتے رہنے کی توفیق عنایت فرماتا رہے۔

اس اسوہ کے حوالے سے ہم مزید دو ایک سوالات کو زیر بحث لانا ضروری سمجھتے ہیں' تاکہ یہ بحث ابتدائی حوالے سے اپنی تکمیل تک پہنچ جائے۔ پس اس ضمن میں ایک سوال تو یہ ہے کہ رسول کی اتباع و اطاعت سے آخر ہم کیا مراد لیتے ہیں۔

اسی طرح ایک دوسرا سوال یہ کیا جاتا ہے کہ قرآن حکیم میں ارشاد ہوا ہے کہ ما اتاکم الرسول فخذوہ وما نھاکم عنہ فانتھوا (59/7)۔ جو کچھ رسول تمہیں دے دیا کرے' اسے لے لیا کرو۔ اور جس سے وہ تمہیں روک دیا کرے' اس سے رک جایا کرو۔ پس کیا اس سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ رسول اکرم ﷺ کو آمر و ناھی ہونے کا مقام حاصل ہے؟ وہ جس چیز کا امر کریں اسے اختیار کرنا اور جس سے روکیں اس سے رک جانا ہمارے ایمان کا لازمی تقاضا ہے؟ لہٰذا ثابت ہوا کہ آپ ﷺ کا فرمان یا اسوہ ہمارے لئے وجوب کی حیثیت رکھتا ہے؟ اس سوال کا جواب ہے کہ ہم گذشتہ صفحات میں دیکھ چکے ہیں کہ شریعت سازی کا آپ ﷺ کو کچھ اختیار حاصل نہ تھا۔

شریعت سازی خالصتاً اللہ تعالیٰ کا اختصاص ہے۔ اس لئے جب آپؐ کو شریعت سازی کا اختیار ہی حاصل نہیں تو پھر آپؐ اپنی جانب سے اپنے طور پر کوئی شریعت سازی کر ہی نہیں سکتے چہ جائیکہ اس حوالے سے آپؐ کوئی امر یا نہی کریں۔ شریعت سازی کرنے یا حلت و حرمت کو جاری کرنے کا اختیار صرف اللہ تعالیٰ کو حاصل ہے۔ نبی کا فریضۂ منصبی صرف اللہ تعالیٰ کی ٹھہرائی ہوئی شریعت کی تبلیغ اور تنفیذ کرنا ہوا کرتا ہے اور حلت وحرمت کے حوالے سے وہ کسی حلال کو حرام یا حرام کو حلال اپنی ذات کے لئے بھی نہیں ٹھہرا سکتا۔۔۔ چہ جائیکہ وہ دوسروں کے لئے حلت وحرمت سازی کر سکے۔ اللہ تعالیٰ حلت وحرمت کے حوالے سے اپنے رسولؐ سے یوں خطاب فرماتا ہے کہ یایھا النبی لم تحرم ما احل اللہ لک (66/1)۔ اے نبی جو کچھ اللہ تعالیٰ آپ کے لئے حلال ٹھہرا چکا ہے آپ بھلا اسے اپنے لئے کیوں حرام ٹھہرائیں گے۔ اہل روایات نے اس آیت جلیلہ کا جو ترجمہ کیا ہے۔ اس سے اس مقام پر ہمیں کوئی بحث نہیں ہے۔ ہم نے اس کا جو ترجمہ کیا ہے' وہی دراصل عربی زبان اور اس کی قواعد کے حوالے سے صحیح ترین ترجمہ ہے۔ جس سے یہ امر روز روشن کی طرح عیاں ہو جاتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے ٹھہرائے ہوئے حلال وحرام میں نبی اپنی ذات کے لئے بھی کوئی تبدیلی کر سکنے کا مجاز نہیں ہوا کرتا۔ لہٰذا نبی کو بالاصل شریعت سازی یا حلت وحرمت کا کوئی ایسا حق ہی حاصل نہیں ہوتا کہ جس کی اساس پر وہ ازخود کسی امر یا نہی کو جاری یا نافذ کرنے کا مجاز ہو۔ لہٰذا اسی حوالے سے تو نبی کے کسی امر یا نہی کا کوئی سوال ہی زیر بحث نہیں ہے۔ اب آیئے دیکھیں کہ اس مقام پر جس آیت جلیلہ کا حوالہ دیا گیا ہے' اس کا سیاق و سباق کیا ہے۔ تو اس مقام پر مال فئی کی تقسیم اور اس سے پیدا ہونے والے مسائل کا اللہ تعالیٰ حل بتا رہے ہیں۔ ارشاد فرمایا جا رہا ہے۔ کہ مال فئی میں سے جو کچھ تمہیں الرسول عطا کرے' اسے خوش دلی سے قبول کر لیا کرو اور جس مال و متاع کی طرف ہاتھ بڑھانے سے وہ روک دیا کریں' اس سے رک جایا کرو۔ یعنی یہاں پر مادی چیزوں کے لینے یا ان سے باز رہنے کا حکم ہے۔ یہاں پر معنوی حوالے سے امر و نہی کا کوئی امکان ہی نہیں ہے۔ نیز یہ احکام آپ کے بحیثیت امیر ملت کے ہیں۔ لہٰذا آپؐ کے بعد اسلامی نظام اور اسلامی جماعت کا جو بھی سربراہ ہوگا۔ اس کے احکام کی بھی اس حوالے سے اتباع و اطاعت امت پر واجب ہوگی۔ اب چونکہ امت مسلمہ خلافت علی منہاج الرسالت کے نظام کو ملوکیت میں تبدیل کر کے دین اور دنیا کی ثنویت کے عذاب میں مبتلا ہو چکی ہے۔ اسی لئے ان امور کی تفہیم اور اس کا ادراک اس کے لئے خاصہ مشکل ہو چکا ہے۔ حالانکہ یہ کوئی مشکل بات نہ تھی۔ بشرطیکہ دین اپنی جامعیت اور کاملیت کے ساتھ خلافت علی منہاج الرسالت کی صورت میں جاری و ساری رہتا۔ خلاصہ کلام یہ کہ محمد رسول اللہ ﷺ کا اسوہ بھی سابق انبیاء کے اسووں کی طرح کلام اللہ قرآن پاک میں محفوظ کر دیا گیا ہے۔ لہٰذا کتاب اللہ کی اتباع و اطاعت جس طرح محمد رسول اللہ ﷺ پر فرض تھی اسی طرح امت پر فرض ہے۔ لیکن اس فریضہ تنفیذ سے عہدہ برآ ہونے کے لئے جماعتی سطح پر خلافت علی منہاج الرسالت کا ہونا ازبس ضروری ہے۔ اللہ تعالیٰ اس کے قیام کی ہمیں توفیق عطا فرمائے۔

اطاعت و اتباع الرسول: گذشتہ بحث تو اسوہ کے حوالے سے تھی۔ اب اسی عنوان پر رسول اللہ ﷺ کی

اطاعت و اتباع کے حوالے سے بحث کی جاتی ہے۔ تاکہ طلبائے قرآن کے لئے قرآن فہمی کے حوالے سے اس موضوع کی اہمیت اور اس حوالے سے قرآنی موقف کی علی وجہ البصیرت وضاحت کی جا سکے۔ یاد رہے کہ اس عنوان میں دو الفاظ مرکزی نوعیت کے ہیں۔ یعنی اطاعت اور اتباع۔ اتباع سے تو یہ مراد ہے کہ جس طرح رسول اکرم ﷺ کتاب اللہ کی پیروی کرتے تھے' تمام اہل ایمان بھی اس کی اسی طرح پیروی کریں۔ یعنی محمد رسول اللہ ﷺ اپنے قلب و قالب کے حوالے سے کلی طور پر اور کامل ترین صورت میں کتاب اللہ کے ماتحت اس کے تابع اور اس کی سو فیصد اتباع کرنے والے تھے۔ لہٰذا اس حوالے سے ہمارے لئے آپ ﷺ کا نمونہ یہی ہے کہ ہم بھی اس کی صحیح معنی میں پیروی کریں۔ ہمارا اس طرح کتاب اللہ کی انفرادی و اجتماعی طور پر پیروی کرنا دراصل الرسول کی اتباع کرنا ہے اور بس۔ اب جہاں تک اطاعت الرسول کا تعلق ہے۔ تو یہ اطاعت اتباع سے ذرا اپنی نوعیت اور مزاج کے حوالے سے مختلف چیز ہے۔ اطاعت کسی زندہ شخص یا نظام کی ہوا کرتی ہے۔ قرآن حکیم میں اطیعوا الکتاب کا کہیں حکم نہیں دیا گیا۔ بلکہ اللہ' الرسول اور اولی الامر کی اطاعت کا حکم دیا گیا ہے۔ پھر یہ تین اطاعتیں نہیں ہیں۔ بلکہ اصل مطاع دراصل ایک ہے اور وہ ہے اللہ تعالیٰ کی ذات۔ جس کا مظہر اتم فکری ونظریاتی طور پر کتاب اللہ ہے اور عملی طور پر اس سے مراد وہ مرکزی نظام ہے جو اہل ایمان کو کتاب اللہ کے تقاضوں سے عہدہ برآ ہونے کا انفرادی و جماعتی سطح پر پابند ٹھہراتا ہے۔ لہٰذا اللہ اور رسول کی اطاعت سے مراد اس مرکز ملت کی اطاعت ہے اور یہ مرکز بھی براہ راست اپنی اطاعت نہیں کرا سکتا۔ اس کے لئے بھی اس کے مقرر کردہ صاحبان امر ہوں گے **جو کتاب اللہ کی حدود میں رہتے ہوئے** مرکزی نظام کے نافذ کردہ ضابطوں کی تنفیذ کریں گے۔ پس ان حدود اللہ کے اندر رہتے ہوئے ان کی اطاعت بھی امت مسلمہ کے لئے لازم ہوگی۔ لہٰذا اطاعت الرسول سے مراد کسی ایک یا بہت سی کتابوں کے مجموعوں کی اطاعت نہیں ہے۔ بلکہ اس سے مراد اس مرکزی نظام کی اطاعت ہے اور اس مرکزی نظام کی اطاعت کو اللہ اور الرسول کی اطاعت سے تعبیر فرمایا گیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے قرآن پاک میں اس کی وحدانیت کا اظہار کرنے کے لئے مفرد کی ضمیریں استعمال کی ہیں۔ دیکھئے (24/48, 8/24,/20)۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

کے ایل گابا

رسول اللہ ﷺ اور معجزات

لوگ اس بات کے عادی ہو چکے ہیں کہ پیغمبروں سے معجزات طلب کریں۔ کہا جاتا ہے کہ یسوع ناصری نے ہر طرح کے معجزات دکھائے، حتیٰ کہ تخلیق کے مسلمہ قوانین کو بھی زیروزبر کر کے مردوں کو جگایا، سمندر پر چہل قدمی کی، گناہوں کو دھوڈالا اور روٹی کو گوشت اور شراب کو خون بنا کر دکھا دیا۔ معمولی سے معمولی ولی اللہ اور راہبوں نے بھی کم از کم بیماریوں سے شفا بخشی، صحیح پیش گوئیاں کیں۔ بانجھ عورتوں کو صاحب اولاد کر دکھایا۔ ان کی بددعاؤں نے بادشاہوں کا تختہ الٹ دیا اور سلطنتوں کو بیخ و بن سے اکھاڑ پھینکا۔

لیکن اس کے برعکس محمد (ﷺ) کا دعویٰ اس سلسلہ میں یہ ہے کہ آپ پر جو قرآن نازل ہو رہا ہے اس جیسی فصیح و بلیغ کتاب کے مقابلہ میں کوئی دوسری کتاب لے آؤ۔ کتاب تو امر دیگر ہے ایک سورۃ ہی پیش کر دو۔ پھر آپ خود اس کے مصنف ہونے کا دعویٰ نہیں کرتے اگر وہ صرف اتنا ہی کر لیتے تو لوگ آپ کو دنیا کا سب سے بڑا شاعر تو ضرور ہی تسلیم کر لیتے۔

معجزہ طلب کرنے والوں اور کفار کے لئے آپ ﷺ کا سیدھا سادھا سا جواب ہے کہ اگر تمام روئے زمین کے انسان اور کائنات کی جملہ ارواح اپنی انتہائی کوشش کر لیں اور ایک دوسرے کی مدد پر بھی آ جائیں۔ تب بھی قرآن جیسی کتاب تصنیف کرنے میں کامیاب نہ ہو سکیں گے۔ آپ ﷺ فرماتے ہیں کہ خدا تعالیٰ نے مجھ کو معجزات دکھانے کے واسطے مبعوث نہیں فرمایا۔ مجھے تو کتاب اور حکمت سکھانے کا فرض سونپا گیا ہے۔ آپ ﷺ دریافت فرماتے ہیں ''کیا میں بجز ایک فانی انسان اور پیغمبر کے کچھ اور ہوں؟'' اور پھر خود ہی جواب دیتے ہیں ''اگر دنیا میں فرشتے بستے ہوتے تو اللہ آسمان سے ایک فرشتے ہی کو بنا کر بھیجتا۔ ہم نے محمدؐ کو بشیر و نذیر بنا کر بھیجا ہے''۔ جو لوگ آپ کو مافوق البشر سمجھتے ہیں ان کے سامنے آپؐ صاف و صریح آیات پڑھ کر سناتے ہیں اور اس سلسلہ میں واضح طور پر اعلان فرماتے ہیں کہ خدائی طاقتیں میرے قبضہ میں نہیں ہیں۔ نہ مجھے قوانین قدرت کا علم ہے۔ نہ مجھے فرشتہ ہونے کا دعویٰ ہے۔ آپ بار بار اس بات کا بھی اعادہ فرماتے رہے ہیں کہ مجھے خدا تعالیٰ کی مرضی کے بغیر خود اپنے نفع نقصان کا اختیار حاصل نہیں ہے۔

بعض اوقات آپ ﷺ سے کہا جاتا ہے کہ ہم اس وقت تک آپ پر ایمان نہیں لائیں گے۔ جب تک آپ زمین سے بہتے ہوئے چشمے جاری نہ کر دیں یا کھجوروں کا ایک پھلتا پھولتا باغ نہ اگا دیں۔ جس میں بافراط پانی کی نہریں جاری ہوں یا آسمان سے کوئی ٹکڑا توڑ کر دکھائیں۔ یا پھر سونے کا ایک محل تعمیر کر دیں۔ جس پر چڑھ کر آپؐ آسمان پر پہنچیں اور وہاں سے ایک کتاب لائیں جسے ہم پڑھ سکیں۔ ان لوگوں کے جواب میں جو خدا کی ہستی کو ان نشانیوں سے پہچاننا چاہتے ہیں۔ آپ اس کی کل کائنات کو بطور جواب پیش کرتے ہیں۔ انسان، حیوانات، دن رات کا تسلسل، فضائے بسیط میں کُروں کی گردش، اس کی بے شمار نعمتیں مثلاً باغات، چشمے، پہاڑ، قرمزی شفق اور تاروں بھرا آسمان اور فرماتے ہیں کہ کیا یہ سب چیزیں خالق مطلق کے وجود کی نشانیاں نہیں۔

ماخذ: پیغمبر صحراؐ

(بشکریہ ندائے خلافت، بابت 30 دسمبر 2004ء تا 5 جنوری 2005ء)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

محمد شریف لون

بزموں کی بزم آرائیاں

محترم محمد شریف لون صاحب نے گذشتہ ماہ کے آخر میں 24/12/2004 تا 31/12/2004 گوجرانوالہ، گجرات، جہلم، راولپنڈی اور پشاور کی بزم ہائے طلوع اسلام کا دورہ کیا۔ اس دوران انہوں نے جو مختصر نوٹس تحریر فرمائے وہ آپ کی خدمت میں پیش کئے جاتے ہیں۔ (مدیر)

گوجرانوالہ میں قریباً ایک بجے بعد دوپہر پہنچا۔ محترم نمائندہ بزم کو آمد کی پہلے اطلاع کر دی گئی تھی۔ قریباً پچیس تیس اراکین بزم تشریف لائے۔ ہر ایک سے فرداً فرداً تعارف ہوا۔ گل روڈ پر نمائندہ صاحب نے درس کا اہتمام کر رکھا ہے۔ یہ سڑک اور طلوع اسلام لازم وملزوم ہیں۔ کسی سے طلوع اسلام کا ذکر کریں وہ آپ کو گل روڈ کا راستہ دکھائے گا۔ تمام اراکین صرف فکر قرآنی سے وابستہ ہی نہیں ہیں بلکہ ٹھوس نالج بھی رکھتے ہیں۔ یہ شہر مذہبی پیشوائیت کا گڑھ ہے۔ مگر قرآنی فکر کی شمع بھی پوری طرح روشن ہے۔ ممبران نے بتایا کہ طویل مدت بعد ادارہ کے کسی چیئرمین کا یہ پہلا دورہ ہے۔ میں نے اپنے 45 سالہ تجربہ کی بنا پر چند گذارشات پیش کیں۔ جن پر عمل پیرا ہو کر رسالہ طلوع اسلام کی اشاعت بھی بڑھائی جاسکتی ہے اور طلوع اسلام کی شائع کردہ کتب کو بھی مزید بہتر طور پر روشناس کرایا جا سکتا ہے۔ معزز اراکین نے بھی اپنے قیمتی مشوروں سے نوازا۔ انشاء اللہ تعالیٰ ان کی روشنی میں بہتر نتائج حاصل ہوسکیں گے۔ شام چھ بجے کے قریب احباب سے رخصتی چاہی اور پھر ملاقات کا وعدہ کیا۔ سب نے کنونشن کا اہتمام کرنے کا تقاضا کیا۔

24/12/2004

گجرات آمد کی اطلاع چند پرانے احباب کو پہلے ہی کی جا چکی تھی۔ قریباً دس بارہ افراد شادمان کالونی میں طاہر لون صاحب کے گھر میں تشریف فرما تھے۔ ان میں وہ احباب بھی شامل تھے جو گذشتہ کنونشنوں میں شمولیت کر چکے تھے۔ ان سب کا اصرار تھا کہ کنونشن کا جلد اہتمام کیا جائے۔ تقریباً دو گھنٹہ کے خطاب میں ڈاکٹر مرزا اکرم مرحوم اور شیخ قدرت اللہ ایڈووکیٹ مرحوم کا ذکر کر کے احباب سے درخواست کی کہ وہ پھر سے بزم تشکیل کریں۔ محمد اقبال شاہین صاحب کی زیر سرپرستی شاہین پبلک لائبریری (فری) مچھیانہ ضلع گجرات میں قائم ہے۔ انہوں نے بڑی تحقیق اور کاوش سے غلام احمد پرویز مرحوم کے دروس قرآن کے موضوعات پر ایک کتاب مجھے پیش کی۔ میں نے وعدہ کیا کہ یہ ٹرسٹ میں پہنچا دی جائے گی۔ طاہر لون کے ہاں طلوع اسلام کا شائع کردہ تمام لٹریچر موجود ہے۔ تمام حاضرین نے وعدہ کیا کہ وہ بزم قائم کرنے میں پورا تعاون کریں گے۔ قرآنی فکر کو عام کرنے کے لئے کئی تجاویز پیش کیں اور احباب

نے عمل کرنے کا وعدہ کیا۔

25/12/2004

گجرات سے جہلم پہنچا۔ محترم قمر پرویز صاحب نمائندہ بزم یہاں کے مشہور ایڈووکیٹ ہیں اور ان کے بچے بھی فکر قرآنی سے پوری طرح آگاہ ہیں۔ انہوں نے نئی جگہ پر رہائش اختیار کی ہے۔ لہٰذا ان کا گھر تلاش کرنے میں کچھ تگ ودو کرنا پڑی۔ چونکہ ان کو میں نے اپنی آمد کی اطلاع کر دی تھی۔ لہٰذا وہ اپنی تمام مصروفیات چھوڑ کر محوِ انتظار تھے۔ ان سے کافی طویل گفتگو ہوئی۔ ان سے گذارش کی کہ وہ رسالہ طلوع اسلام کی اشاعت بڑھانے میں اقدامات کریں۔ وہ پرانے مخلص ساتھی ہیں۔ امید ہے ان کی کاوشوں سے بزم بہت ترقی کرے گی۔ شام چار بجے کے قریب ان سے رخصت چاہی۔

26/12/2004

بعد دوپہر راولپنڈی پہنچ کر نمائندہ بزم چوہدری نثار صاحب سے رابطہ قائم کیا۔ مگر وہ بہت علیل تھے۔ ان کے ہاں مزاج پرسی کے لئے جانے کی کوشش کی۔ مگر انہوں نے بتایا کہ وہ ڈاکٹر کے ساتھ مصروف ہیں۔ اس طرح ان سے ملاقات نہ ہوسکی۔ بزم کا خریدکردہ دفتر صرف باہر سے ہی دیکھ سکا۔ کیونکہ وہ بند تھا۔ بہرحال ایک دو پرانے اراکین سے ملاقات کی۔ انشاء اللہ پھر کسی موقع پر بزم کے دیگر اراکین سے ملاقات کی کوشش کی جائے گی۔

28/12/2004

راولپنڈی سے پشاور آمد ہوئی۔ نمائندہ بزم ڈاکٹر بشیر الحق صاحب کے گھر پر ان سے ملاقات کی اور ان کے ادارہ سے گہرے تعلقات اور تعاون کے لئے شکریہ ادا کیا۔ ڈاکٹر صاحب بہت ہی مخلص شخصیت کے مالک ہیں۔ ان کے ہاں محترم عظیم صاحب اور نوجوان سخی آپریدے سابق نمائندہ بزم طلوع اسلام باڑہ۔ جان خاں کلے سے ملاقاتیں ہوئیں۔ عظیم صاحب واقعی عظیم انسان ہیں۔ ان کی شہر کے پررونق حصہ میں سٹیشنری اور کتابوں کی بہت بڑی دوکان ہے جہاں پر طلوع اسلام کی شائع کردہ کتابیں فروخت کے لئے موجود ہیں۔ قرآنی فکر کے بہت بڑے پرچارک ہیں اور سخنے۔ دامے اور درمے مدد کے لئے تیار رہتے ہیں۔ سخی آفریدی بڑی متحرک شخصیت کے مالک ہیں اور گورنمنٹ ہائی سکول منیز گڑھی ڈلوری تیراہ اورکزئی ایجنسی میں ٹیچر ہیں۔ وہ 30 تاریخ کو تمام دن میرے ساتھ رہے۔ ان کی وساطت سے شیر افضل خاں جیسے پرانے مخلص دوست سے ان کے گھر پر ملاقات ہوئی۔ ان کا گھر اتنا وسیع ہے کہ وہاں کنونشن کا انتظام ہوسکتا ہے۔ آفریدی صاحب کی رہبری میں بزم کے پرانے دوستوں سے ملاقاتیں ہوئیں۔ اگر سخی آپریدے میرے ساتھ نہ ہوتے تو شائد میں اس قدر وسیع پیمانے پر Contacts نہ کرسکتا۔ اس نوجوان آفریدی نے بزم باڑہ کے مظلومین ابراہیم اور خالد کا بھی ذکر کیا کہ ادارہ ان کے لئے کچھ کرے۔ وہ اب بھی زیرعتاب ہیں۔ میں نے ان سے وعدہ کیا کہ لاہور جاکر اس سلسلہ میں جو کچھ ہوسکا کروں گا۔

دوران ملاقات چند احباب نے ذکر کیا کہ صابر صدیقی کی کتاب کا مسودہ طلوع اسلام ٹرسٹ کے پاس پڑا ہے۔ اگر کتاب شائع نہیں ہوسکتی تو یہ مسودہ واپس کر دیا جائے تاکہ وہ اپنے ہاں اسے چھپوا سکیں۔ ان سے وعدہ کیا کہ لاہور میں ٹرسٹ اتھارٹی سے بات کروں گا۔ ہر جگہ احباب نے شکوہ کیا کہ عرصہ دراز سے کنونشن منعقد نہیں ہوسکی۔ اس کا انتظام کیا جائے۔

31/12/2004-29-30/12/2004

پشاور سے فیصل آباد واپس پہنچا۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

نقد ونظر

کتاب : ہم لوگ (افسانے)
مصنف : صلاح الدین اکبر
تعداد صفحات : 142
قیمت : 100 روپے
ناشر : مکتبہ اخوت' نزد حسن مارکیٹ' (مچھلی منڈی)' اردو بازار' لاہور۔
تبصرہ نگار : محمد سلیم اختر

☆☆☆

محترم ڈاکٹر صلاح الدین اکبر صاحب اردو زبان کے اہم فکشن رائٹرز اور قرآنی دانشوروں میں نمایاں مقام کے حامل ہیں۔ 1923ء میں سرگودھا میں پیدا ہوئے' ایف۔ایس۔سی کا امتحان 1940ء میں گورنمنٹ کالج لدھیانہ سے پاس کیا اور ایم۔بی۔بی۔ایس کنگ ایڈورڈ میڈیکل کالج لاہور سے کیا۔ افسانہ نویسی اور ڈاکٹری ساتھ ساتھ پروان چڑھتے رہے۔ ان کا پہلا ناول 1951ء میں ''پتھر اور آنسو'' کے عنوان سے شائع ہوا۔ معرکہ آرا ناول ''انسان'' 1963ء میں شائع ہوا جس میں قرآنی فکر کو فکشن میں ڈھالنے کی نہایت خوبصورت کوشش کی گئی۔ اس ناول پر عظیم مفکر قرآن علامہ غلام احمد پرویز نے ماہنامہ ''طلوع اسلام'' میں شاندار الفاظ میں تحسین وتبصرہ شامل فرمایا۔

ان کا پہلا کہانیوں کا مجموعہ ''البم اور سائے'' کے نام سے 1966ء میں منصۂ شہود پر آیا جس نے اس وقت کے ادبی حلقوں میں بھرپور خراج تحسین وصول کیا۔ کہانیوں کا دوسرا مجموعہ ''ناگفتہ بہ'' کے نام سے 1976ء میں شائع ہوا اور اب تقریباً 27 برس کے بعد ان کا تیسرا افسانوں کا مجموعہ ''ہم لوگ'' اشاعت پذیر ہوا ہے۔ ''ہم لوگ'' میں شامل افسانوں میں وہ خصوصیات زیادہ پختہ اور ارتقاء یافتہ شکل میں موجود ہیں جو ان کے پہلے مجموعوں کے افسانوں کا طرۂ امتیاز ہیں۔ دلچسپ اور سادہ و رواں حقیقت نگاری اور بیانیہ انداز ان افسانوں کا وصفِ خاص ہے۔ اس دوران ڈاکٹر صاحب نے ملکی سیاسی' سماجی اور ثقافتی موضوعات پر بھی بے شمار مضمون تحریر کئے جن میں سے بیشتر ''طلوع اسلام'' کے اوراق کی زینت بنتے رہے ہیں۔ ہمارا خیال ہے کہ اگر ڈاکٹر صاحب ان مضامین کو مرتب فرما دیں تو ایک وقیع مجموعۂ مضامین تیار ہو جائے گا۔ علاوہ ازیں ڈاکٹر صاحب اپنی یادداشتوں پر مشتمل آٹو بائیوگرافی بھی تحریر فرما رہے ہیں جو ہمیں یقین ہے کہ خاصے کی چیز ہو گی۔ ''یارانِ چمن'' کے نام سے خاکے بھی انہوں نے مرتب کر لئے ہیں' امید ہے کہ وہ بھی جلد اشاعت پذیر ہو جائیں گے۔ ڈاکٹر صاحب کا قلم' نشترِ جراحت کی طرح' کبھی رکا نہیں ہے۔ امید ہے وہ آئندہ بھی اسی طرح خوبصورت افسانے تخلیق کرتے رہیں گے۔

TWO AND A HALF PERCENT!

By
Aboo B. Rana

==========

We all heard the tragic news of the natural disaster and damage of Tsunami, resulting in heavy loss of lives due to an eruption at the bottom of the Indian Ocean. Of over 147,000 people that have been found dead or missing, Indonesia alone has lost over 100,000 lives, as I am writing. It is not within Human control, to avoid the anger of Mother Nature, however, we can take lessons from these warnings and do what we can to improve our way of living. The first thing that came to my mind, after hearing the shocking news was, if only somebody could put all our religious preachers on a plane and send them to join the Indonesian preachers, to hold a religious rally, pacifying the sentiments of those who have lost all their life time of efforts and their loved ones. They should hold "All Preachers Islamic Conference," and rallies in wrecked areas, and try now and explain to the survivors that these floods are the will of Allah, and now they must not complain or cry. Instead of crying and grieving over their loved ones, they must now pray five times, give whatever they are left with now, to build mosques in Allah's name, and recite Quran all the time. Let us see, how many of them will embrace their Islam, in this hour of their tragedy?

Whereas millions of dollars and euros from various Non-Muslim countries are pouring in, to provide relief to those grief stricken family members who have lost all their belongings, apart from their loved ones, in the deluge; while aid from third world Muslim countries is just a trickle. In the Quran in Chapter 2, verse 143 it is clearly stated:

> *"We have, thus made you (meaning those who believe in the words of Allah) the finest nation, so that you may administer and manage the affairs or deeds of all mankind!"*

But which nations and who are those people that are actually managing the affairs of mankind, is needless to mention here. Non-Muslims do not, according to Muslim preachers, believe in Allah. But they possess enough humanity to feel the pain of others. The infidels know they cannot love God, as He is far beyond their imagination, but they can feel and do love Life. In the same path, they will not trust a Muslim. *Have we ever asked ourselves why?* Because Muslims don't seem to love life. The religion teaches them to only worship Allah. Gentlemen, let us be honest and admit

this fact. The *Hadith* teaches them a Muslim must donate 2.5% of its material wealth; after giving away 2.5%, he is free to keep the rest of his wealth for himself. ***That is the reason, in the third world Muslim nations, the government treasuries are low, and the public's private treasuries are overflowing.*** Why must any Muslim pay the huge tax amount to the government, when he can get away with just 2.5%. He has nothing to fear, as he has sanctions from the Mullah Alliance. The Mullah takes care of the rich man's wealth, and the rich man embraces the Mullah's words. They both will enter into paradise, and the rest of the mankind may drown in hell. Families maybe looted or suffer in torture, mental or physical, for all they care, but these wealthy magnets only have 2.5% to give. This is our attitude towards each other as Muslims, and to the infidels is given even less, lest they may not come to know how much wealth the Muslim has. Since we Muslims are running after each others wealth, we think the infidels will also do the same with us. We forget, there is no such thing as 2.5% in the religious books of Non-Muslims. We forget, they think differently from us. They give out whole heartedly, when they come to know, if anyone or any nation is truly in distress and suffering. But to give to Muslims – the infidel nations have to think twice. *Why.....?* For Muslims will only donate 2.5% of their wealth. The rest of the wealth these Muslims are sanctioned by their priests to take with them to Heaven. That is the Muslims' religious way of life!

Gentlemen, if we all Muslims want to develop a sincere and serious relationship with Allah, and we want Allah to listen to our prayers, then we shall have to listen to Allah also with open hearts. Then Allah teaches us in the Quran to give protection even to a non-believer. When it comes to others' needs, we are told, in the Quran, (Chapter:2 / verse: 219)

> *"O Messenger! They ask from you as to what amount must we give. Give all your surplus wealth that is above your requirements, for the welfare of mankind. This is how we explain our verses and commands. So you may reckon!"*

But our selfish motives make us think differently. The *Hadith* tells the Muslim to give only two and a half percent of his wealth, and *Hadith* is more important to us than the Quran. In the cold hearted Muslim world of today, *Hadith* over rules the Quran. Alright! So let us go by the *Hadith* now, if that is what our Mullah wants. When we just give 2.5% to others, Allah returns our donation with 2.5% of peace in our lives. So why make an issue out of such a simple equation. We give 2.5% of our wealth for Allah's sake to others, and Allah gives back to us 2.5% of peace. Is that not fair enough a deal? Why do we complain and ask for more peace and Allah's blessings when we have not opened our hearts to more than 2.5% for the sake of Allah for those who

need more. I do not mean, gentlemen, one must just throw away his wealth to any Zaid or Bakr who will waste it. Or leave it for our children to spend it in luxury, when the rest of Muslims are having a hard time making two healthy meals a day. Neither is my contention here to indulge in the religious controversy of 2.5%, nor how did this issue start when Islam was being revealed to Mankind. My primary concern here is only to know how far 2.5% of our donated wealth, which is mentioned in *Hadith* books, can help solve our present day pressures.

Today, if any Muslim government needs aid, we remain stubborn on giving just 2.5% of all the wealth we possess. Why are we astonished, when starving individuals are searching, which person has more money in his 2.5% of wealth. Is it his neighbour or is it someone they can reach living far away in another city? Or perhaps may beg for more amounts from the 2.5% of someone's wealth, living in another nation. The family needs of an average citizen, everyone knows, cannot be fulfilled with the 2.5% of religious donation in this nation. Is that not the reason, thinking hearts, we are losing most of our manpower. Or labour is begging for jobs, one way or another, from foreign Muslims. We are being treated like giving a bone to a dog, because the 2.5% of oil rich nations is a bigger amount than 2.5% of a wealthy man living in Pakistan. That is why our top brains and quality labour wants to move abroad, in order to provide healthy environment to their families. And why not?

In the original Islam, Quran commands the Muslims to put 100% of their surplus wealth in the government treasury. The command of Quran, in the original words is *"Qullil Affo,"* (Chapter 2: verse 219). And our feudal lord or the wealth owner does a favour, by parting with only 2.5% of his wealth. The Mullah seconds the feudal lord and says, *"Jazaak Allah* this man is a true Muslim." The Mullah does not tell, the rest of the Muslims are working day and night, yet, still their families are living in frustration. The quality or standard of living, gentlemen, shall never see the beauty of peace, unless natural provisions for a healthy living are not opened for every victimized and frustrated human being, in every province or country. *This is not me writing, this is what Quran tells us if we care to read it carefully.* No ***true Muslim*** can get a peaceful sleep in the perverted version of Islam in which we live today. Thinking hearts, this is how the vicious circle of wealth entraps the hearts of the rich Muslims; when the words of Quran become meaningless and Islam is changed into a factory, to toss out stereotype Mullahs. And we remain rest assured that Pakistan is becoming stronger with wealth. Perhaps so! Yet no one cares, that as families we are being torn apart. Wealth will always break a heart, as wealth has only the power to break; but to make a heart…. we

need peace of mind too. That is why in the religion of Non-Muslim countries, at least, there is no concept of 2.5% *bakhshish*.

The words of Caliph Omar[RA] are resonating in my mind, and my spirit freezes, who said in his reign, *"Even if a dog dies of hunger, in this Islamic system, Omar will be held responsible in the court of Allah!"* This was the spirit of Islam, those Caliphs inherited from Muhammud[PBUH] and their conviction in those principles of living was in the core of their hearts.

O Allah! I only want to ask, if our Mullahs can show me how many Muslims now will be praying five times in Indonesia, in this hour of calamity? Or rather are they mentally capable of praying in this time of desperation? And how much of peace can our Mullahs bring in the lives of those troubled survivors, with their 2.5% of religious donations? Leave aside the donations, how many of these preachers of Islam, have gone on location to share with survivors their sorrow and grief? ***If I will have opened the heart of even one Maulana only 25% instead of 2.5% towards that real and peaceful Islam, I will not have struggled all my life in vain.***

O Allah! We do not desire the darkness of ignorance, we need Your light;
O Allah! We need Your blessings and peace, we do not desire Your wrath;
O Allah we await Your beauty of peace, so increase our knowledge;
O Allah! Do not make my heart cry; I know little of Your mysterious ways!
Rub'ana taqabul minna, inna ka untus samee ul aleem!

==========